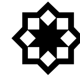
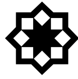
صدائے حق

مفتی محمد مکرم محی الدین حسامی قاسمی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ

نام کتاب	:	صدائے حق
مؤلف	:	مفتی محمد مکرم محی الدین حسامی قاسمی
تعداد صفحات	:	176
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار (1000)
ناشر	:	الکرم پبلیشرز مغلپورہ
قیمت	:	ایک سو بیس روپئے (۱۲۰ روپئے)

 ملنے کے پتے 

الکرم پبلیشرز مغلپورہ	فون نمبر	:	9866743411
			9704095041
دکن ٹریڈرس چار مینار	فون نمبر	:	040-24521777
سنابل بک ڈپو مغلپورہ	فون نمبر	:	9347024207
دارالعلوم حیدرآباد شیورام پلی	فون نمبر	:	040-24016479

فہرست مضامین

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد جمال الدین قاسمی دامت برکاتہم
صدر مفتی دارالعلوم حیدرآباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد

دنیا مسلسل تغیر پذیر ہے، آئے دن اس میں واقعات وحوادث پیش آتے رہتے ہیں، شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جس میں کوئی خوش کن یا غم انگیز واقعہ پیش نہ آتا ہو، پیش آنے والے واقعات اگرچہ تکوینی نظام کے تحت وجود میں آتے ہیں؛ لیکن ان میں ہمارے لئے بڑا پیغام ہوتا ہے، وہ ہماری کوتاہیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں اوران سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، لہذا ایک مسلمان کا یہ شیوہ ہونا چاہئے کہ وہ واقعات کے ظاہری اسباب میں گم ہوجانے کے بجائے ان کو عبرت آمیز اور موعظت خیز نظر سے دیکھے اوراپنی عملی زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کرے، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں اکثر جگہوں پر کائناتی نظام کو ذکر کرنے کے بعد اس سے سبق حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، **فاعتبروا یااُولی الابصار**

زیر نظر کتاب ''صدائے حق'' عزیز گرامی قدر مولانا مفتی محمد مکرم محی الدین زید علمہ وفضلہ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں کسی نہ کسی پیش آمدہ واقعہ یا خصوصی حالت سے متأثر ہونے کے بعد لکھا ہے اور جو ملک کے مشہور ومعروف جرائد ومجلوں میں شائع ہوچکے ہیں، عزیز موصوف نے ان مضامین کے لکھتے وقت قلم کچھ اس انداز سے اٹھایا ہے کہ وقت گزرنے کے باوجود اس میں کہنگی محسوس نہیں ہوتی بلکہ تازگی وافادیت صاف جھلکتی ہے، ہر مضمون تحقیق ووسعتِ مطالعہ کا آئینہ دار ہے، حوالہ کا اہتمام ہے، اکابر کے

علوم سے استفادہ کیا گیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پڑھنے کے دوران مضمون نگار کا سوز درون اور اندرونی تڑپ صاف محسوس ہوتی ہے۔

موصوف کے قلم سے اس سے پہلے بھی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہے ''طہارت ونماز کے مسائل قرآن وسنت کی روشنی میں'' جس میں فقہ حنفی کے مطابق نماز وطہارت کے مسائل کو خوب چھان پھٹک کر مدلل طور پر لکھا گیا، ''وضاحت مسئلہ رفع یدین'' ''عاملین ومحصلین زکوۃ'' ''مروجہ تقاریب نکاح'' وغیرہ کتب بھی شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں، امید ہے کہ قارئین کرام اس مجموعہ کو بھی شوق کے ہاتھوں لے لیں گے اور موصوف کی دیگر کتابوں کی طرح یہ بھی مقبول خاص وعام ہوگا۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز**

دعا ہے کہ اللہ تعالی موصوف کو مزید قلمی خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور اس مجموعہ کو لوگوں کے لئے نافع اور مرتب کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔آمین وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

محمد جمال الدین

(۱۴۳۵/۴/۵ھ)

عرض مؤلف

الحمدللہ بندہ کو خدائے تعالٰی کی توفیق سے مختلف موضوعات پر لکھنے کا موقع ملا، اس میں بالعموم حالات وتقاضوں کا لحاظ رکھا گیا، اسلامی نقطہ نظر اور طریقِ حق کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی، بعض معاشرتی ومعاشی وفقہی مسائل کو بھی زیر بحث لایا گیا، فرد کی زندگی سے متعلق بھی کچھ باتیں لکھی گئیں، یہ مضامین زیادہ تر شہر حیدرآباد کے دو مشہور ماہنامے ''ضیائے علم'' و ''ندائے صالحین'' میں شائع ہوئے، جو درحقیقت مدیر ضیائے علم استاذ محترم حضرت مولانا سید احمد ومیض ندوی مدظلہم کے ارشاد وحکم اور مدیر ندائے صالحین کے کہنے پر لکھے گئے تھے، مختلف گوشوں سے ان تحریروں کی پذیرائی ہوئی اور بندے کے جملہ اساتذہ وبزرگوں نے بھی حوصلہ افزائی فرمائی، فجزاہم اللہ احسن الجزاء

ہمارے والد محترم جناب محمد مظہر محی الدین صاحب زید مجدہم - جو بندہ کے علمی امور کی بھی نگرانی فرماتے ہیں، ویسے آپ بلحاظ پیشہ انجینئر ہیں مگر نہایت وسیع المطالعہ، صاحب علم وعمل اور شعروادب کے حوالے سے صاحبِ دیوان بزرگ ہے اور حضرت محدث دکنؒ کے حلقہ ارادت سے وابستہ ہیں - کا ارادہ ہوا کہ ان منتشر مضامین کی یکجا کتابی شکل میں اشاعت ہو تاکہ اس کی افادیت باقی اور عام ہو، استاذ محترم فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد جمال الدین صاحب قاسمی دامت برکاتہم کی خدمت میں یہ بات رکھی گئی اور ان تحریرات پر نظر ثانی اور تقریظ کی درخواست کی گئی، حضرت نے اپنی گوناگوں علمی ودعوتی مصروفیات کے باوجود بعض مضامین پر نظر ثانی فرمائی، ان کی نوک و پلک کو درست فرمایا اور ایک وقیع تحریر بھی عنایت فرمائی جو بے شبہ کتاب کی قدر وقیمت میں برکت واضافہ کا باعث ہے، اس موقعہ پر بندہ اپنے جملہ بزرگوں بشمول جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدرآباد کے ناظم عالی مقام محترم جناب رحیم الدین انصاری صاحب زید مجدہم کا احسان مند ہے کہ جن کی دعاؤں وتوجہات سے بندہ اس خدمت کے قابل بنا، اللہ تعالی ان تمام کو اپنے شایان شان اجر جزیل عطا فرمائے اور اس حقیر خدمت کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرماکر اس کے نفع کو عام وتام فرمائے۔ آمین

محمد مکرم محی الدین حسامی قاسمی عفی عنہ

۳/شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ م ۲/جون ۲۰۱۴ء

انتساب

حضرت اقدس استاذی مولانا سید شاہ نور اللہ قادری کرنولی رحمۃ اللہ علیہ

و

واعظ دکن حضرت مولانا حمید الدین حسامی عاقل صاحب رحمۃ اللہ علیہ

و

عارف باللہ سیدی واستاذی حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمٰن صاحب مفتاحی مدظلہ

ان اولیاء کرام کی طرف انتساب کو بندہ اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا ہے اور
هم القوم لا يشقى بهم جليسهم کے خوش نصیب جلیسوں میں شامل ہونے کا امیدوار ہوتا ہے۔



حسنِ عمل کا معیار: اخلاص اور اتباعِ سنت

بڑی شان ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے، اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، جس نے موت اور زندگی اس لیے پیدا کی تا کہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے اور وہی ہے جو مکمل اقتدار کا مالک اور بہت بخشنے والا ہے۔ (سورۂ ملک: ۱،۲)

یہ سورۂ ملک کی ابتدائی دو آیتوں کا ترجمہ ہے، جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذاتِ بے مثال کا تعارف کرانے کے بعد موت وحیات کی پیدائش کے اپنے فعل کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ موت وحیات کی پیدائش کی حکمت ''حسنِ عمل'' (بہتر عمل) کے حوالے سے انسانوں کی آزمائش ہے۔

امامِ رازیؒ فرماتے ہیں: حسنِ عمل سے مراد عملِ مقبول ہے اور عملِ مقبول وہ ہے جو خالص ہو اور درست بھی ہو، اگر عمل خالص ہے مگر درست نہیں تو وہ مقبول نہیں، اسی طرح عمل درست ہے مگر خالص نہیں تو وہ بھی مقبول نہیں، عمل خالص وہ ہے جو محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے اور درست عمل وہ ہے جو سنت کے مطابق ہو۔ (تفسیر کبیر ۱۵/ ۳۹۶)

گویا اخلاص اور اتباعِ سنت دو ایسے ارکانِ عمل ہیں جن پر اعمال کی قبولیت کا دارومدار ہے، ایک کا تعلق حسنِ باطن سے ہے اور ایک کا حسنِ ظاہر سے۔

اخلاص

اخلاص: تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے (۱) حسنِ نیت (۲) اخلاص (۳) صدق۔

(۱) حسنِ نیت: حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اور ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالیں جو صبح وشام اپنے پروردگار کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پکارتے رہتے

ہیں۔(الانعام:۵۲)اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیت سے مراد یہ ہے کہ عمل سے حق تعالیٰ کی ذات اوراس کی خوشنودی مقصود ہو۔

نبی کریم ﷺ ارشادفرماتے ہیں: اعمال کا (یعنی اعمال کے مقبول ہونے نہ ہونے کا) مدارنیت پر ہے۔جیسی نیت ہوگی ویسے ہی اس پر اثرات مرتب ہوں گے۔سیدنا عمرؓ کا مقولہ ہے: جس کی نیت صحیح نہیں اس کے عمل کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یحیٰ بن کثیرؒ فرماتے ہیں: نیت کرنا سیکھو، اس لیے کہ یہ عمل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے ارشادفرمایا: بہت سے معمولی اعمال نیت کی صحت کی وجہ سے عظیم الشان ہوجاتے ہیں اور بسا اوقات بہت بڑے بڑے اعمال نیت کے فساد کی وجہ سے معمولی و بے حیثیت بن جاتے ہیں۔(جامع العلوم والحکم ۱/۶۹ و۷۱)

حسنِ نیت ایک عظیم دولت ہے جس کی برکت سے آدمی کے نامۂ عمل میں مفت وہ نیکیاں بھی درج کردی جاتی ہیں جن کو عملاً انجام دینے کا اسے موقع مل نہ سکا۔رسولِ پاک ﷺ ارشادفرماتے ہیں: قیامت کے دن لوگوں کے صحیفۂ اعمال حق تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے اور حق تعالیٰ فرمائے گا کہ ان کو پھینک دو کیونکہ ان اعمال سے اس شخص کو میری ذات مقصود نہ تھی اور کچھ بندوں کا نامۂ اعمال پیش ہوگا تو حکم ہوگا کہ فلاں فلاں عمل اور درج کردو، فرشتے عرض کریں گے کہ بارِالٰہا! وہ اعمال تو اس نے کیئے ہی نہیں تھے، حکم ہوگا کہ ان اعمال کی اس نے نیت تو کی تھی اور ہم کو اس کا علم ہے۔(اخرجہ الدارقطنی من حدیث انس باسناد حسن: تخریج احادیث الاحیاء ۱/۱۳۱۷-حلیۃ الاولیاء ۲/۳۱۳)

(۲) اخلاص: اخلاص کا مطلب ہے اپنی طرف سے صرف اللہ تعالیٰ کے تقرب ورضا کا قصد رکھنا اور مخلوق کی خوشنودی ورضامندی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کو ملنے نہ دینا۔ارشادِ ربانی ہے: اور انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ بندگی کو بالکل یکسو ہوکر صرف اسی کے لیے خالص رکھیں۔(البینۃ:۵)

اخلاص ایسی کلیدِ سعادت ہے کہ بعض اہلِ بصیرت کا قول ہے کہ اگر ایک ساعت بھی اخلاص حاصل ہوجائے تو نجات مل جائے۔حضرت سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں: مبارک ہو

اس کو جس کا ایک قدم بھی ایسا اٹھا جس سے مقصود خدا ہی کی ذات ہو۔ حضرت معروف کرخیؒ اپنے نفس کو مارتے اور فرمایا کرتے تھے کہ اے نفس! اخلاص پیدا کرتا کہ خلاصی ونجات حاصل ہو۔ (احیاء العلوم: فضیلۃ الاخلاص ۴/۳۷۸)

(۳) صدق: صدق کا مطلب آدمی قول وقرار کا سچا ہو، عزم کا پختہ ہو، عزم کو عمل کا روپ دینے کا دُھنی ہو، ظاہر وباطل کا یکساں ہو، اخلاقِ عالیہ کے انتہائی درجہ پر فائز ہو چکا ہو۔ (احیاء العلوم: فضیلۃ الصدق ۴/۳۸۸) صدیقیت وہ اعلیٰ ترین مقام ہے جس کا درجہ مقام نبوت کے معاً بعد اور مقامِ شہادت وصالحیت سے مقدم وافضل ہے۔ (سورۂ نساء: ۶۹)

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کلام پاک میں صادقین کی شانِ وارفتگی کو بڑے ہی پُر لطف انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ: انہی ایمان والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچا کر دکھایا، پھر ان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے اپنا نذرانہ پورا کر دیا اور کچھ وہ ہیں جو ابھی انتظار میں ہیں اور انہوں نے (اپنے ارادوں میں) ذراسی بھی تبدیلی نہیں کی۔ (الاحزاب: ۲۳) (تبلیغِ دین ملخصاً: ۲۴۰-۲۵۰)

اتباع سنت

دوسرا رکن جس پر عمل کی قبولیت موقوف ہے وہ اتباعِ سنت ہے؛

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اگر تم ان کی فرمانبرداری کروگے تو ہدایت پا جاؤ گے اور رسول کا فرض اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ صاف صاف بات پہنچا دیں۔ (سورۂ نور: ۵۴)

اس آیتِ شریفہ میں بڑے ہی دوٹوک انداز میں ہدایت کو آپ ﷺ کی اطاعت وپیروی سے وابستہ کر دیا گیا ہے، اب چاہے جو عمل وطریقہ بھی ہو اگر وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق نہیں تو خواہ وہ عامل کی نظر میں کتنا ہی بھلا وعمدہ معلوم ہو، ہدایت وقبولیت سے کبھی شرفیاب نہیں ہوسکتا۔ رسولِ پاک ﷺ کھلے طور پر فرماتے ہیں: جو شخص ایسا کام کرے جس کے لیے ہمارا حکم نہیں وہ مردود وباطل ہے۔ (مسلم شریف: ۴۵۸۹) ایک اور ارشاد ہے: قول عمل کے بغیر اور

قول وعمل حسن نیت کے بغیر اور قول وعمل اور حسن نیت ؛ اتباعِ سنت کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔(کنز العمال :۱۰۸۳) حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: کوئی قول اور عمل اور نیت ؛سنت کی موافقت کے بغیر درست ہی نہیں ہوتا۔(تلبیس ابلیس :۹) حضرت احمد بن ابوالحواریؒ فرماتے ہیں: جو عمل بھی اتباعِ سنت کے بغیر کیا جائے وہ باطل ہے۔(مدارج السالکین ۳/ ۱۱۹) سلطان العارفین ابو یزید البسطامیؒ نے اپنے بعض ساتھیوں سے فرمایا: ذرا اس آدمی کے پاس چل کر دیکھتے ہیں جو ولایت میں اپنے آپ کو مشہور کر رکھا ہے، وہ آدمی مرجع الخلائق بنا ہوا تھا اور زاہدِ زمانہ کہلاتا تھا، جب وہاں پہنچے تو وہ موصوف مسجد میں تھے،اس دوران ان موصوف کو تھوکنے کی ضرورت پیش آئی تو قبلہ کی جانب تھوک دیا، اتنا دیکھنا تھا کہ حضرت ابو یزید بسطامیؒ وہاں سے الٹے پاؤں واپس لوٹ گئے اور اس کو سلام تک نہ فرمایا، اپنے احباب سے فرمایا: یہ آدمی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب وطریقوں میں سے ایک طریقہ پر بے اعتماد ثابت ہوا ہے تو ولایت وبزرگی کے معاملہ میں کیسے اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے(الرسالۃ القشیر یہ ۱/ ۵۷) پیشوائے طریقت حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کے بے شمار طریقے اور راستے ہیں مگر مخلوق کے لیے تمام راستے بند ہیں، اس کے لیے صرف وہی راستہ کھلا ہوا ہے جو اتباعِ رسول ﷺ کی شاہراہ ہے۔(مدارج السالکین ۳/ ۱۲۱)

اعمال کو مطابقِ سنت بنانے کی کیا اہمیت ہے اور کتنا اونچا مقام ہے، اس کی وضاحت کے لیے بزرگانِ دین کے چند اقوال وواقعات ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

حضرت مخدوم جہانیاں (۷۰۷-۷۸۵ھ) ارشاد فرماتے ہیں: ایک ولی کے لیے ممکن ہے کہ وہ ہوا میں اڑے، پانی پر چلے، اس کے لیے زمین اور آسمان کی طنابیں کھینچ جائیں لیکن وہ اس وقت تک ولی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنی گفتار، رفتار اور کردار میں اپنے پیغمبر یعنی حضرت رسول اللہ ﷺ کا پیرو نہ ہو۔(بزمِ صوفیہ:۴۷۹)

حضرت معین الدین چشتیؒ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بار آپؒ وضو کرنے میں انگلیوں کا خلال کرنا بھول گئے تو غیب سے آواز آئی کہ محبتِ رسول کا دعویٰ اور سنت کا ترک؟ آپؒ نے فوراً توبہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔(تاریخ مشائخ چشت: ۱۲۵)

حضرت بایزید بسطامیؒ کا حال یہ تھا کہ تمام عمر اس خیال سے خربوزہ نہیں کھایا کہ معلوم نہیں جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کو کس طرح کھایا ہے؟ (سوانح مولانا رومؒ: ۱۰)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے ایک مرتبہ کسی خادم سے فرمایا کہ فلاں مقام پر لونگیں رکھی ہیں، کچھ دانے لے آؤ، وہ چھ دانے لے آیا، اتنی ذرا سی بات میں ترکِ سنت آپ کو ناگوار ہوا اور ناخوشی کے لہجہ میں فرمایا کہ ہمارے صوفی کو اب تک یہ بھی معلوم نہیں کہ عدد طاق کی رعایت سنت ہے، پھر فرمایا میں تو وضو میں منہ دھوتے وقت یہ خیال رکھتا ہوں کہ پہلے داہنے رخسارے پر پانی پڑے کیونکہ تیامن (سیدھی جانب سے آغاز کرنا) بھی سنت ہے۔ (تذکرہ مجدد الف ثانیؒ: ۲۳۲)

حضرت سید احمد شہیدؒ فرماتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے فضائلِ ظاہری، مراتبِ باطنی، روشن دل اور صفائیٔ قلب جو کچھ حاصل ہوتی ہے وہ سب اتباعِ شریعت کی برکت اور پیرویٔ سنت کی سعادت سے ہے۔ (سیرت سید احمد شہید: ۲/۵۱۳)

مزید فرماتے ہیں: تمام عبادات و معاملات اور امورِ معاشیہ و معادیہ (دنیاوی و اخروی کام) میں حضرت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے طریقے کو پوری قوت اور بلند ہمتی کے ساتھ پکڑا جائے۔ (حوالہ سابق)

حضرت مولانا محبّ الدین صاحب ولایتی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے اور بڑے صاحبِ کشف تھے، ایک دفعہ ان کو یہ خیال ہوا کہ حدیث میں ایسی نماز کی بڑی فضیلت آئی ہے جس کے لیے کامل وضو کیا جائے پھر دو رکعت ایسی پڑھی جائے کہ ان میں حدیث النفس نہ ہو یعنی ان میں کوئی خیال نہ آوے، وہ عالم بھی تھے، انہوں نے دل میں کہا کہ افسوس ساری عمر میں ایسی دو رکعت بھی نصیب نہ ہوئیں، لاؤ دو رکعت تو کوشش کر کے ایسی ہی پڑھ لیں، چنانچہ اس میں کامیاب ہوئے اور چونکہ خطرات اکثر آتے ہیں ان کو روکنے کے لیے انہوں نے نماز میں آنکھیں بند کر لیں کہ اگر نظر منتشر ہوتی ہے تو عادتاً یکسوئی نہیں ہوتی اور ادھر ادھر کے خیالات آنے لگتے ہیں، آنکھ بند کرنے سے ان کو یکسوئی ہوگئی اور کوئی خطرہ نہیں آیا، پھر خیال ہوا کہ عالمِ مثال میں اس نماز کی کیا شکل ہوگی متوجہ ہو کر دیکھا تو اس نماز کی

صورت سامنے آئی، نہایت حسین وجمیل سر سے پاؤں تک آراستہ پیراستہ آنکھیں بھی نہایت خوبصورت لیکن غور سے جو دیکھا تو ان میں روشنی نہیں تھی، ان کو تعجب ہوا کہ اس نماز میں کونسی کسر رہ گئی، رفعِ تردّد کے لیے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں واقعہ عرض کیا، گوانہوں نے کوئی تفصیل اس کی بیان نہیں کی تھی کہ اس طرح آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی تھی، صرف خلاصہ عرض کیا تھا کہ ایسی نماز خطرات سے خالی پڑھی تھی، حضرت نے سنتے ہی فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے دفعِ خطرات کے لیے آنکھیں بند کرلی ہوں گی؟ انہوں نے عرض کیا کہ جی ہاں حضرت! میں نے آنکھیں تو ضرور بند کرلی تھیں تاکہ خطرات نہ پیدا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ چونکہ یہ سنت کے خلاف تھا اس لیے یہ صورتِ نقص دکھلائی گئی، اگر کھلی آنکھوں نماز پڑھتے تو خواہ کتنے ہی خطرات آتے وہ نماز چونکہ سنت کے موافق ہوتی وہ زیادہ مقبول ہوتی۔ (تاریخ مشائخ چشت: ۱۹۲)

مضمونِ بالا کا حافظ شیرازیؒ اور علامہ اقبالؒ کے ان اشعار پر خاتمہ کیا جاتا ہے، جن میں اخلاص اور اتباعِ سنت کا مکمل مفہوم سمو دیا گیا ہے۔ حافظؒ کہتے ہیں ؎

حضوری گر ہمی خواہی از و غافل مشو حافظ　　متی ما تلق من تھوی دع الدنیا و ما فیھا

ترجمہ: اگر تو حضوری چاہتا ہے تو اس سے غافل نہ ہوا اے حافظ! جس کو تو چاہتا ہے اس سے تب ملاقات کر سکے گا جب تو دنیا و مافیہا کو ترک کر دے گا۔ (حیاتِ حبیب: ۳۹۸)

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ترجمہ: اپنے آپ کو مصطفیٰ ﷺ کے قدموں میں پہنچا کہ دین تمام تر وہی ہیں، اگر تو ان (ﷺ) تک اپنی رسائی نہ کرے گا تو یہ سراسر کافری و بولہبی ہے۔ (کلیاتِ اقبال: ۵۷۴)

ماہ محرم الحرام: اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ

اہل عرب کے یہاں تاریخِ سنین ضبط کرنے کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا، بعض لوگ سالوں کی گنتی کا حساب کسی غیر معمولی جنگ یا حادثہ کے پیش آنے کے وقت سے کرتے، بعض لوگ کسی سخت قحط یا خشک سالی کے زمانے سے سالوں کا حساب ڈالتے، بعض لوگ کسی حاکم وگورنر کے تقرری کے سال سے حساب لگایا کرتے، بعض لوگ کسی قبیلہ کے سردار کی موت کو بنیاد بناتے اور بعض لوگ کچھ اور طریقے اختیار کرتے (تاریخ الطبری ۳۹۱/۲) لیکن ظاہر ہے یہ ساری چیزیں ایسی نہیں ہیں، جن پر سبھوں کا اتفاق ہو سکے، اس کے علاوہ ان حوادث و واقعات کی کوئی تاریخی حیثیت بھی نہیں ہوتی، اس لئے ان جیسی چیزوں سے حساب کرنے کا سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا اور لوگ تاریخِ سنین کے معاملہ میں اختلافات کا شکار ہو کر رہ گئے۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ہجرت کے سولہویں یا سترہویں سال یعنی وفاتِ نبی ﷺ کے چھٹویں یا ساتویں سال یہ پیچیدگی کھل کر سامنے آئی، اس کا سبب یہ بنا کہ حضرت ابوموسی اشعریؓ جو حضرت عمرؓ کی جانب سے ایک علاقہ کے گورنر تھے، انھوں نے حضرت عمرؓ کو یہ خط لکھ بھیجا کہ اے امیر المؤمنین! ہمارے پاس آپؓ کے سرکاری خطوط آیا کرتے ہیں لیکن ان پر کوئی تاریخ رقم نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے ہم الجھن میں رہتے ہیں، حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو اسی وقت مشورہ کے لئے جمع فرمایا، بات یہ طئے ہوئی کہ تاریخ میں مہینہ اور سن دونوں کا ذکر ہونا چاہیے لیکن اختلاف اس میں ہوا کہ سالوں کا حساب کہاں سے لگایا جائے، بعضوں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت سے بعضوں نے کہا: وفاتِ نبی ﷺ سے حضرت علیؓ نے یہ رائے دی کہ ہجرت سے سالوں کا حساب لگایا جائے، کیوں کہ ہجرت ایک ایسا عمل ہے، جس کے ذریعہ اللہ کے رسول ﷺ نے سرزمین شرک کو خیر آباد کہا ہے، حضرت عمرؓ نے اس رائے کی بھرپور تائید کی اور فرمایا کہ ہاں! اس کی وجہ سے حق اور باطل میں امتیاز ہوا ہے (الکامل فی التاریخ ۱۳/۱ المنتظم فی تاریخ الملوک ۲۲۷/۴) یہ واقعہ ہے کہ

ہجرت سے اسلامی تاریخ کا آغاز ایک بہت بڑی قربانی اور ایک لافانی سبق اپنے اندر رکھتا ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ ہر شخص کو اپنے وطن، اپنی جائے پیدائش اور اپنے عزیز واقارب کے ٹھکانوں سے محبت اور والہانہ لگاؤ ہوتا ہے، بے وجہ کوئی آدمی اپنے وطن کو نہیں چھوڑتا، وطن کی خاک اور وہاں کے ذرات تک سے آدمی کو دلی تعلق ہوتا ہے اور یہ ایک فطری بات ہے، اس بنا پر بعض دلائل کی روشنی میں بعض علماء نے کہا ہے: وطن کی محبت بھی ایمان کی ایک علامت ہے، اپنے ہم وطنوں سے بھلائی وہمدردی وہاں کے کمزور و بدحال لوگوں کا تعاون اور اپنے رشتہ داروں سے حسن سلوک ایمان کا حصہ ہے (کشف الخفا ۳۹۹/۱)

مکہ مکرمہ ویسے بھی اللہ کے رسول ﷺ کا مولد رہا ہے، آپ ﷺ کے آباو اجداد پشتہا پشت سے وہاں آباد تھے، وہاں کے درودیوار، وہاں کے راستوں وریگزاروں اور ٹیلوں اور چشموں سے ان کی یادیں وابستہ تھیں، پھر وہ توحید کا اولین مرکز بھی تھا، اس لئے طبعی طور پر اللہ کے رسول ﷺ کو مکہ سے جدائی نہایت شاق معلوم ہوئی، حد یہ ہوئی کہ وطن سے بہت دور نکلنے کے بعد، جب تعاقب کرنے والوں کی طرف سے کچھ اطمینان سا نصیب ہوا تو سرورِ عالم ﷺ عین اس شاہراہ پر آ گئے، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع تھی، وہاں دیر تک بڑی بیقراری سے اپنی اور اپنے والد کی جائے پیدائش کو یاد فرماتے رہے، محبوب خدا ﷺ کی اس بیقراری پر آسمان سے فوراً ہی یہ آیت اتری "جس خدا نے آپ پر قرآن کے احکام پر عمل اور اس کی تبلیغ کو فرض کیا ہے وہ آپ کو آپ کے اصلی وطن مکہ میں پھر پہنچادے گا (سورہ قصص: ۸۵) (التفسیر المنیر ۱۷۵/۲۰) تاہم ان سارے جذبات وتعلقات کے باوجود، اللہ کے رسول ﷺ نے محض اللہ کی رضا حاصل کرنے، آزادی کے ساتھ ایک خدا کی عبادت کرنے اور بندگانِ خدا کو راہ راست پر لانے کے لئے، اپنے وطن عزیز کو ہمیشہ کے لئے خیرآباد کہدیا اور اس سرزمین کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا، جہاں آپ ﷺ اپنی زندگی کے پچاس سے زائد بہاریں گزاریں تھیں، یہ ایک ایسا فداکارانہ کارنامہ ہے، جسے بجا طور پر اسلامی تاریخ وتقویم کے نقطۂ آغاز بننے کا اعزاز وشرف ملنا چاہیے، چنانچہ متفقہ طور پر واقعۂ ہجرت سے اسلامی تقویم کے آغاز کو تسلیم کرلیا گیا، جب یہ معاملہ طئے ہوگیا کہ اسلامی کیلنڈر کا

آغاز کہاں سے ہوتو اب دوسرے نمبر پر یہ بحث پیدا ہوئی کہ سال کی شروعات کس مہینے سے مانی جائے؟ بعض لوگوں نے رائے دی کہ رمضان المبارک سے ہو، لیکن حضرت عثمانؓ کی رائے یہ ہوئی کہ محرم سے سال کی شروعات ہو، کیوں کہ یہ مہینہ مناسکِ حج سے فراغت کے بعد، حجاج کرام کا اپنے اپنے ملکوں کو لوٹنے کا ہے پھر یہ مہینہ شروع ہی سے قابل احترام سمجھا جاتا ہے، اہل عرب باوجود لڑائی اور جنگوں کے دلدادہ ہونے کے، اس مہینہ میں قتل اور غارت گری سے بالکلیہ اجتناب کیا کرتے تھے (تاریخ دمشق: ۴۲/۱) واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں جو ماہِ محرم سے وابستہ ہیں، بڑی ہی انقلابی اور عبرت انگیز ہیں، فریضۂ حج ادا کر کے انسان گناہوں سے دھلا دھلایا، اپنے وطن واپس ہوتا ہے، یہاں سے اس کی زندگی کی نئ شروعات ہوتی ہے، فکر وعمل کی پاکیزگی اور روح میں بالیدگی کی نئ بنیاد پڑتی ہے، یہ نہایت خوش آئند موقع ہے کہ اس ماہ سے اسلامی سال کی شروعات بھی ہو، ماہ محرم کا قدیم دور سے چلا آرہا احترام، پوری انسانیت سے یہ اپیل کرتا ہے کہ ایک دوسرے کا احترام بجالایا جائے ،اخلاقی اقدار کی پاسداری کی جائے اور ایک دوسرے کے کشت وخون سے مکمل احتراز کیا جائے! الغرض یہ فلسفہ وسبق ہے اسلامی تقویم کے سن ہجری سے آغاز کا اور ماہ محرم سے سال شروع کرنے کا اللہ تعالی ہماری عملی زندگی میں یہ اسباق پیدا فرمائے!

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ ماہ محرم کی ایک تاریخی حیثیت ہے لیکن اس ماہ مبارک کی دسویں تاریخ کو چند ایسے عالمگیر قسم کے واقعات رونما ہوئے ہیں، جنھوں نے ماہ محرم کی تاریخی حیثیت کو اور بھی دو چند کر دیا، صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو عاشوراء کے دن ہی فرعونیوں سے نجات ملی اور فرعون اپنے لشکر سمیت دریا میں غرق ہوا (مسلم شریف: ۱۱۳۰)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے نبی ﷺ کا گزر چند یہودیوں کے پاس سے ہوا، جو عاشورا کے دن روزہ رکھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: یہ کیسا روزہ ہے ؟انہوں نے کہا: اس دن اللہ نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو غرق ہونے سے بچایا تھا اور فرعون کو غرق کر دیا تھا اور یہی وہ دن ہے جس میں سفینۂ نوح جودی پہاڑ کے برابر آئی

اور سارے کفار غرق آب ہو گئے ، اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نوح علیہ السلام نے شکرانے میں روزہ رکھا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ زیادہ حق رکھتے ہیں اور اس دن روزہ رکھنے کے زیادہ حقدار ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو اس دن کے روزے کا حکم فرمادیا (مسند احمد: ۸۷۱۷) بعض روایات میں اس کا بھی اضافہ آیا ہے کہ عاشورا کے دن ہی اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تھی؛ یونس علیہ السلام کی بستی والوں کی توبہ کو بھی قبول فرمایا تھا؛ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بابرکت بھی اسی دن ہوئی تھی (طبرانی :۵۵۳۸) اس روایت کے بارے میں علامہ ھیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالغفور نامی ہے جو محدثین کے یہاں متروک (ناقابل اعتبار) ہے (مجمع الزوائد: باب الصوم قبل یوم عاشوراء ۱۸۸/۳) محدث ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ وہ احادیث کو اپنی جانب سے بنایا کرتا تھا (تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ ۸۱/۱) نیز فرماتے ہیں کہ نہ اس کی حدیث لکھنا جائز ہے نہ بیان کرنا سوائے تعجب کے طور پر (المجروحین لابن حبان ۱۴۱/۲) امام بخاریؒ فرماتے ہیں: عبدالغفور کو محدثین نے ترک کر دیا ہے، وہ اجنبی اور انوکھے قسم کے احادیث بیان کرتا ہے (الضعفاء الکبیر للعقیلی ۱۱۳/۳) البتہ اس روایت کا یہ جز کہ عاشوراء کے دن اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام اور قوم یونس کی توبہ قبول فرمائی ہے، دیگر معتبر روایتوں سے بھی ثابت معلوم ہوتا ہے ، چنانچہ ترمذی شریف میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا : ماہِ محرم بھی اللہ کا مہینہ ہے، اس میں ایک ایسا دن ہے، جس میں اللہ نے ایک قوم کی توبہ قبول فرمائی ہے اور آئندہ بھی اس میں دیگر قوموں کی توبہ قبول فرمائے گا (ترمذی: باب ماجاء فی صوم المحرم :۷۴۱)

امام ترمذیؒ نے اس روایت کو حسن قرار دیا اور علامہ منذریؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ۳۶۹/۳) شارحین حدیث کا خیال ہے کہ یہ خاص دن یوم عاشوراء ہے، جس میں اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی توبہ قبول فرمائی تھی (التیسیر بشرح الجامع الصغیر ۳۷۳/۱) حضرت وھبؒ کا ارشاد ہے : اللہ تعالی نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب وحی فرمائی کہ اپنی قوم کو حکم کرو کہ وہ عشرہ محرم میں میری جناب میں توبہ کریں اور جب دسویں تاریخ آجائے تو میری بارگاہ کی جانب نکل پڑیں میں ان کو بخش دوں گا، علامہ ابن رجبؒ فرماتے ہیں یہ روایات یوم عاشوراء میں توبہ کرنے پر ابھارتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس دن میں توبہ کی قبولیت کی امید زیادہ ہے (فیض القدیر ۳۴/۳ ۔حدیث نمبر ۲۶۷۵) یہاں اس بات کی وضاحت بھی رہے کہ عاشوراء کے دن وقوع پذیر واقعات کی طویل فہرستیں بھی بعض روایات میں آئی ہیں: مثلاً یہ کہ اسی دن حضرت ادریس علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا' اسی دن اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا' اسی دن حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے درمیان یکجائی ہوئی، اسی دن حضرت داود علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی، اسی دن حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی سلطنت واپس ملی، اسی دن حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش ختم ہوئی، اسی دن حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے نجات ملی، اسی دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر لے جایا گیا، اسی دن اللہ کے رسول ﷺ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور آسمان و زمین اور لوح و قلم کی پیدائش ہوئی، حضرت جبرئیل و دیگر ملائکہ اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اسی دن ہوئی، آتشِ نمرود سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسی دن نجات ملی، اسی دن حضرت اسمعیل علیہ السلام کا فدیہ دنبہ کی شکل میں دیا گیا، اسی دن اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا، اسی دن قیامت قائم ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت اسی دن ملی وغیرہ وغیرہ............ لیکن یہ ساری روایات انتہائی غیر معتبر ہیں، ایسے ہی صوم عاشوراء کی غیر معمولی فضیلت سے متعلق بھی بعض روایات آئی ہیں، مثلاً یہ کہ جو شخص اس دن روزہ رکھے گا، اس کے چالیس سالہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس کے لئے ساٹھ سالہ عبادت کا ثواب لکھا جاتا ہے، دس ہزار فرشتوں کی عبادت کا ثواب لکھا جاتا ہے، ایک ہزار حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کا ثواب ملتا ہے، دس ہزار شہیدوں کا اجر دیا جاتا ہے، ساتوں آسمانوں کا اجر و ثواب اس کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ مگر یہ تمام روایات بھی نا قابل اعتبار ہیں (تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعۃ: کتاب الصوم ۱۴۹/۲ تا ۱۵۱) اس قسم کی روایات کو احادیثِ رسول ﷺ کی

حیثیت سے بیان کرنا جائز نہیں، واعظین جو خواہ مخواہ اپنے وعظ میں رنگ بھرنے کے لئے ان بے اصل باتوں کو بیان کرتے ہیں، انہیں سرکار دو عالم ﷺ کی اس وعید سے ڈرنا چاہیے کہ جو شخص جانتے بوجھتے مجھ پر جھوٹ کہے گا اسے چاہئے کہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ مقرر کرلے (رواہ البخاری: مشکوۃ کتاب العلم)

ایک مسلمان کے لئے محض اللہ کے رسول ﷺ کا ایک حکم عمل پر کھڑا کرنے کے لئے کافی ہے اور صحیح روایات میں صوم عاشوراء کے جو فضائل وارد ہوئے ہیں، وہ ترغیب وتشویق کے لئے بس ہیں، یہاں صوم عاشوراء کے تعلق سے چند صحیح روایات درج کی جاتی ہیں، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب تک رمضان کا روزہ فرض نہیں ہوا تھا، اللہ کے رسول ﷺ ہمیں عاشوراء کے روزے کا حکم دیا کرتے تھے، اس پر ابھارتے تھے اور ہماری نگرانی فرمایا کرتے تھے، لیکن جب رمضان المبارک کے روزے فرض ہوگئے تو آپ ﷺ نے نہ ہمیں روزہ کا تاکیدی حکم کیا اور نہ منع فرمایا اور نہ اس کی نگرانی فرمائی (مسلم: ۱۱۲۸)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے عاشوراء کا روزہ رکھا کرتے تھے مگر جب رمضان کے روزوں کی فرضیت ہوئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگو! عاشوراء اللہ کے خاص ایام میں سے ایک خاص دن ہے تو جس کا جی چاہے اس دن کا روزہ رکھ لے اور جو نہ چاہے نہ رکھے (مسلم: ۱۱۲۶)

حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عاشوراء کا روزہ ماضی کے ایک سال کے گناہ کا کفارہ ہوجاتا ہے اور عرفہ کے دن کا روزہ سالِ گزشتہ اور سالِ آئندہ کے گناہوں کے لئے کفارہ ہوتا ہے (نسائی شریف: ۲۸۰۹) بہتر یہ ہے کہ عاشوراء کے دن کے ہمراہ ایک دن پہلے یا بعد کا روزہ رکھ لیا جائے اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس بات کا عزم ظاہر فرمایا تھا کہ آئندہ سال ہم نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھیں گے (مسلم عن ابن عباس) مسند احمد کی روایت ہے: عاشوراء کے دن کا روزہ رکھو یہودیوں کے طریقہ کی مخالفت کرو اور عاشوراء سے ایک دن پہلے اور بعد روزہ رکھ لیا کرو (مرقاۃ المفاتیح ۴/۲۸۸)

زندگی غنیمت ہے نیکیاں کمالیجئے

اللہ تعالیٰ بڑا عالی شان ہے، جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، اسی نے موت اور حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے۔(سورۂ ملک:۱/۲)

اللہ تعالیٰ نے جن اور انسانوں کو اس واسطے پیدا کیا کہ وہ انہی کی عبادت کیا کریں۔ (سورۂ ذاریات:۵۶)

زندگی کو غنیمت جانئے

کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا، وہ سمجھ سکتا اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی پہنچا تھا، سو (اس نہ ماننے کا) مزہ چکھو کہ ایسے ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں۔(سورۂ فاطر:۳۲) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: پانچ چیزوں کی پانچ چیزوں سے پہلے پہلے قدر کرلو: (۱) اپنی جوانی کی بڑھاپہ کے آنے سے پہلے، (۲) اپنی تندرستی کی بیماری سے پہلے، (۳) اپنی مالداری کی فقروفاقہ کی حالت آنے سے پہلے، (۴) اپنی فرصت کی مصروفیت میں پھنسنے سے پہلے، (۵) اپنی زندگی کی اپنی موت سے پہلے۔(نسائی: کتاب المواعظ:۱۱۸۳۲)

قیامت کے دن کی جوابدہی کی تیاری کیجئے

اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل قیامت کے واسطے اسنے کیا ذخیرہ بھیجا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے، (سورۂ حشر:۱۸) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: قیامت کے دن اولادِ آدم کے قدم جگہ سے ہٹ نہیں سکتے، جب تک پانچ چیزوں کا حساب نہ لیا جائے، (۱) زندگی کس میں کھپا دی تھی، (۲) جوانی کہاں برباد کی تھی، (۳) مال کہاں سے کمایا تھا، (۴) کن کاموں میں مال

کوخرچ کیا تھا، (۵) اپنے علم پر کتنا اور کیا عمل کیا۔ (ترمذی شریف: باب فی القیامۃ: ۲۴۱۶)

دوزخ کی آگ سے بچنے کی فکر کیجئے

اے ایمان والو تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی اس آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جس پر سخت مزاج اور مضبوط فرشتے مقرر ہیں۔ (سورۂ تحریم: ٦)

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: دوزخ میں بدبخت آدمی ہی داخل ہوگا، صحابہ نے عرض کیا بدبخت کون ہوتا ہے اے اللہ کے رسول؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو اللہ کی فرمانبرداری نہیں کرتا، اور نافرمانی اور گناہ کو نہیں چھوڑتا۔ (ابن ماجہ: باب ما یرجی من رحمۃ اللہ یوم القیامۃ: ۴۲۹۸)

اعمال کا سرمایہ اپنے ساتھ دنیا سے لے جایئے

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں میت کے جنازہ کے ساتھ چلتی ہیں، دو چیزیں واپس لوٹ جاتی ہیں، اور ایک باقی رہ جاتی ہے، اس کے رشتہ دار، اس کا مال واسباب اور اس کے اعمال ساتھ چلتے ہیں، مال اور رشتہ دار واپس ہو جاتے ہیں، اعمال ساتھ رہ جاتے ہیں۔ (بخاری: باب سکرات الموت: ۶۵۱۴) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنی دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے، وہ اپنی آخرت کا نقصان کر لیتا ہے، اور جو اپنی آخرت سے محبت رکھتا ہے، اسے وقتی طور پر اپنی دنیا کا کچھ نقصان اٹھانا پڑتا ہے، تم فنا ہونے والی دنیا کے مقابلے میں ہمیشہ باقی رہنے والی آخرت کو اختیار کرلو۔ (مسند احمد: حدیث ابی موسیٰ الاشعری: ۱۹۶۹۷)

عقلمند مومن کامل بنئے

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، (سورۂ بقرہ: ۲۰۸) ایک شخص نے عرض کیا اے اللہ کے رسول اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم اپنا دل اللہ کے حوالے کردو اور مسلمان تمہاری زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ (مسند احمد : حدیث عمرو بن عبسہ : ۱۷۰۲۷-المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۳۰۱) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: عقلمند آدمی

وہ ہے جو اپنا محاسبہ کرے اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرے، اور بے بس و مجبور آدمی وہ ہے جو اپنے آپ کو خواہشات کے پیچھے لگا دے، اور اللہ سے اچھی اچھی امیدیں باندھے۔ (ترمذی: ۲۴۵۹)

اچھے اور برے عمل کا فائدہ یا نقصان خود اپنے لیے ہے خدا کے لیے نہیں

جو شخص نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے نفع کے لیے اور جو شخص برا عمل کرتا ہے اس کا وبال اسی پر پڑے گا، اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ (سورۂ حم السجدہ: ۴۶)

حدیث قدسی ہے: اے میرے بندو ظلم کو میں نے اپنے اوپر حرام کیا ہے، اور تمہارے درمیان بھی حرام ٹھہرایا ہے، لہٰذا تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم مت کرو، اے میرے بندو تم سب گمراہ ہو سوائے اس کے جسے میں ہدایت دوں، تو تم مجھ سے ہدایت مانگو میں تمہیں ہدایت دوں گا، اے میرے بندو تم سب ننگے ہو سوائے اس کے جسے میں کپڑا پہناؤں تو تم مجھ سے کپڑا مانگو میں تمہیں پہناؤں گا، اے میرے بندو تم رات کی تاریکیوں میں اور دن کے اجالوں میں خطائیں کرتے ہو، اور میں سب گناہوں کو بخشتا ہوں، تو تم مجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہو، میں تمہارے گناہ معاف کروں گا، اے میرے بندو اگر تم مجھ کو نقصان پہونچانا چاہو تو ہرگز نہیں پہونچا سکتے اور نفع پہونچانا چاہو تو نفع بھی نہیں پہونچا سکتے، اے میرے بندو اگر تمہارے اگلے پچھلے انسان اور جنات سب تم میں متقی ترین آدمی کی طرح بن جائیں، تو اس سے میری شان میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوگا، اور اگر سب کے سب بدترین آدمی کی طرح ہو جائیں، تو اس سے میری بادشاہت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوگی، اے میرے بندو، اگر تمہارے اگلے پچھلے انسان جنات تمام کے تمام ایک چٹیل میدان میں جمع ہو جائیں پھر مجھ سے اپنی اپنی ضرورت کا سوال کریں، اور میں ہر ایک کی ضرورت پوری کر دوں تو اس سے میرے خزانہ میں اتنی بھی کمی پیدا نہیں ہوگی جتنی سمندر میں سوئی ڈال کر نکالنے پر ہوتی ہے۔ (مسلم شریف: باب تحریم الظلم: ۲۵۷۷)

ہر وقت اللہ کا دھیان رکھئے

اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ رہتا ہے، چاہے تم لوگ کہیں بھی ہو۔ (سورۂ حدید: ۴)

اور اللہ تعالیٰ انسان کی رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔(سورۂ ق:۱۶)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اللہ کے حدود کی حفاظت کرو، اللہ تمہاری حفاظت کرے گا، تم اللہ کی تابعداری کرو، تم اللہ کو اپنے روبرو پاؤ گے۔(ترمذی شریف:۲۵۱۶)

نماز کی پابندی کیجئے

اور اپنے متعلقین کو (یعنی خاندان والوں کو اور دیگر مومنین کو) بھی نماز کا حکم کرتے رہیے اور خود بھی اس کے پابند رہیے، (سورہ طٰہٰ:۱۳۲) اور آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں بیشک نیک کام مٹا دیتے ہیں، برے کاموں کو، (سورۂ ہود:۱۱۴) بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے، (سورۂ عنکبوت:۴۵) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کا حساب کیا جائے گا، اگر نماز اچھی ہوئی تو باقی اعمال بھی اچھے ہوں گے، اور اگر نماز خراب ہوئی تو باقی اعمال بھی خراب ہوں گے، (طبرانی اوسط:من اسمہ احمد:۱۸۵۹) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: جو نماز نہ پڑھے اس کا کوئی دین نہیں نماز کا درجہ دین میں ایسا ہی ہے جیسے سر کا درجہ بدن میں ہے۔(طبرانی اوسط:من اسمہ احمد:۲۲۹۲)

غیبت، دھوکہ، جھوٹ، غصب، سود کی لعنت سے اپنے آپ کو بچائیے

معراج کے سفر میں آپ ﷺ کا گذر ایک ایسی قوم پر سے ہوا، جن کے ناخن تانبے کے تھے، جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، آپ ﷺ نے پوچھا اے جبرئیل یہ کون لوگ ہیں؟ حضرت جبرئیل نے عرض کیا یہ وہ لوگ ہیں جو انسانوں کا گوشت کھاتے تھے، (یعنی غیبت کرتے تھے) اور ان کی عزتوں سے کھلواڑ کرتے تھے، (ابوداؤد: باب فی الغیبۃ:۴۸۷۸) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو ہم کو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں۔(مسلم: باب قول النبی من غشنا:۱۶۴) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سچائی نیکی کی طرف اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور جھوٹ برائی کی طرف اور برائی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے، (بخاری: باب ما ینہی عن الکذب:۶۰۹۴) جو آدمی کسی کی بالشت بھر زمین دبا لیتا ہے، تو کل قیامت کے دن ساتوں زمین اس کے گلے کا طوق بنائے جائیں گے، (بخاری: باب من ظلم شیئا من

الارض:۲۴۵۲)رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ہم میں مفلس وہ کہلاتا ہے جو پیسہ اور سامان نہ رکھتا ہو، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز روزہ زکوٰۃ اپنے ساتھ لے کر آئے گا، لیکن دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی کسی پر الزام لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون کیا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا، جس کے بدلے میں اس کی نیکیاں ان لوگوں کو دے دی جائیں گی، پھر اگر حساب پورا ہوگیا ہوگا تو ٹھیک ہے ورنہ ان لوگوں کی برائیاں اس کے سر پر ڈالی جائیں گی، پھر جہنم میں اس کو پھینک دیا جائے گا،(مسلم: باب تحریم الظلم ۲۰۸۱) سود خوری کے گناہ کے بہتّر درجات ہیں کم ترین گناہ اتنا ہے کہ آدمی مسلمان رہ کر خود اپنی ماں سے بدکاری کر بیٹھے،(طبرانی کبیر: عن عبداللہ بن سلام:۴۱۱)مسلمان سے گالم گلوج کرنا معصیت اور گناہ ہے، اور لڑائی جھگڑا کرنا کفر اور حرام ہے۔(بخاری: باب ما ینہی من السباب:۶۰۴۴)

ماحول کو پاکیزہ رکھئے، بے حیائی، بدنگاہی، بدکاری کو قریب بھی آنے نہ دیجئے

اور بدکاری وزنا کے پاس بھی مت پھٹکو بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے، اور بری راہ ہے۔(بنی اسرائیل: ۳۲) جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی و بدکاری پھیلے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔(سورۂ نور: ۱۹) آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔(سورۂ نور: ۳۰) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: آنکھوں کا زنا بدنگاہی ہے کانوں کا زنا حرام چیزوں کا سننا ہے، زبان کا زنا فحش اور بے حیا باتیں کرنا ہے، ہاتھوں کا زنا حرام چیزوں کا پکڑنا ہے، پیروں کا زنا گناہ کے راستہ پر چلنا ہے، دل بدکاری کے منصوبے تیار کرتا ہے پھر شرمگاہ کبھی اس کا ساتھ دیتی ہے، اور کبھی نہیں دیتی۔(مسلم شریف: باب قدر علی ابن آدم حظہ من الزنا وغیرہ:۲۶۵۷) کان آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی۔(بنی اسرائیل:۳۶)

اچھائیوں کو فروغ دیجئے برائیوں کو دور کیجئے

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دینی مددگار ہیں جو نیک

کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور ان کے رسول ﷺ کے حکم پر چلتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ضرور رحم فرمائیں گے، بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔ (سورۃ توبہ:۷۱) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: وہ شخص ہم سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے، نیکی کا حکم نہ کرے اور برائی سے منع نہ کرے۔ (ترمذی: باب ما جاء فی رحمۃ الصبیان:۱۹۲۱) جو شخص تم میں سے کسی برائی کو دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے بدل دے اگر ہاتھ سے بدلنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اس کو بدل دے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دل سے اسے برا جانے یعنی اس برائی کا دل میں غم ہو اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ (مسلم: باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان :۷۸) اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کی غلطیوں پر سب کو عذاب نہیں دیتے البتہ سب کو اس صورت میں عذاب دیتے ہیں جب کہ فرمانبردار لوگ باوجود قدرت کے نافرمانی کرنے والوں کو نہ روکیں۔ (طبرانی کبیر: عرس بن عمیرہ الکندی:۳۴۳)

اللہ سے شرم کیجئے

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ سے اتنی شرم کرو جتنی اس سے شرم کرنے کا حق ہے، صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! ہم اللہ کے فضل سے اللہ سے شرم تو کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ مطلب نہیں بلکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے شرم وہ شخص کرتا ہے جو سر کو اللہ کی نافرمانی سے بچاتا ہے اور سر سے لگے ہوئے اعضاء کو بھی اور جو پیٹ کو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچاتا ہے اور پیٹ سے لگے ہوئے اعضاء کو بھی اور جو موت کو اور موت کے بعد کے حالات کو یاد کرتا ہو، جو شخص آخرت کا طلب گار ہوتا ہے، وہ دنیا کی زیب وزینت چھوڑ دیتا ہے، پس جو ایسا کرے گا تو وہ اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کرے گا۔ (ترمذی:۲۴۵۸)

اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیے

اے ایمان والو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ (سورۂ نور:۳۱) تم

اللہ ہی کی طرف دوڑو، (سورۂ طور: ۵۰) اے ایمان والو تم سب اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو امید ہے کہ تمہارا رب (اس توبہ کی بدولت) تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، (سورۂ تحریم: ۸) اور ایسے لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی (کوئی توبہ قبول ہے) جن کو حالتِ کفر پر موت آ جاتی ہے ان لوگوں کے لیے ہم نے ایک درد ناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ (سورۂ نساء: ۱۸)

زندگی غنیمت ہے نیکیاں کما لیجئے موت کا بھروسہ کیا یہ تو آنی جانی ہے

تقاریبِ نکاح کو پاکیزہ اور مطابقِ سنت بنانے کی ضرورت

نکاح، دین کا وہ بابرکت شعبہ ہے جو تمام انبیاء کی زندگیوں کا لازمی جزء رہا ہے، کتاب وسنت میں نکاح اور متعلقاتِ نکاح کا تفصیلی بیان نیز قانونی باریکیاں وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں، ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے نکاح سے وجود میں آنے والے رشتۂ مصاہرت (سسرالی رشتے) کو بطورِ امتنان کے یعنی اپنے فضل واحسان کی یاددہانی کے طور پر بھی ذکر فرمایا ہے، چنانچہ سورۂ فرقان میں ہے: اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا اور تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے (آیت:۵۴)

اور ارشاد ہے: اور اُسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو اُن کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں (الروم:۲۱) رشتۂ نکاح کے اسی تقدس واحترام کی وجہ سے مذہب اسلام میں نکاح کی حیثیت، یوروپ ومغرب کی طرح مطلق شہوت رانی کی شریفانہ راہ یا باہمی کنٹراکٹ جیسی نہیں ہے، اسلام کی نگاہ میں نکاح ایک ایسا باعظمت اور ذمہ دارانہ رشتہ ہے جو آدھے دین کی تکمیل سے عبارت ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: جب کوئی آدمی شادی کرتا ہے تو وہ آدھے دین کی تکمیل کر لیتا ہے پس اسے چاہئے کہ بقیہ نصف حصے میں اللہ سے ڈرتا رہے (بیہقی شعب الایمان: فصل فی الترغیب فی النکاح:۵۱۰۰) عباداتِ محضہ کے کئی ایک خدوخال نمایاں طور پر اس شعبۂ دین میں بھی پائے جاتے ہیں، مثال کے طور پر نماز واعتکاف کی طرح مجالسِ نکاح کو بھی مسجد میں منعقد کرنے کا منصوص حکم کتبِ حدیث میں پایا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: نکاح کا اعلان وتشہیر کرو اور انہیں مساجد میں منعقد کرو (ترمذی باب ماجاء فی اعلان النکاح :۱۰۸۹) جمعہ وعیدین کی طرح مجالسِ نکاح کا آغاز بھی، خطبہ سے کرنا مسنون قرار دیا گیا ہے،

چنانچہ قرانی ہدایات پر مشتمل، خطبہ نکاح کا مستقل ذکر بڑے اہتمام کے ساتھ کتبِ احادیث میں موجود ہے، خطبۂ نکاح کا خلاصہ یہی ہے کہ عاقدین، اپنی آئندہ زندگی میں تقویٰ اور خوفِ خداوندی کو تھامے رہیں، خدا اور رسول ﷺ کی فرماں برداری میں اس طرح لگے رہیں کہ اسی حالت میں مالکِ حقیقی سے جاملیں، خدا اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری ہی کو اپنا نصب العین اور سب کچھ سمجھیں، اعمال کی درستگی کریں، توبہ واستغفار کریں، رشتوں اور قرابت داریوں کا پاس ولحاظ رکھیں وغیرہ وغیرہ، ہمارے معاشرے سے چوں کہ عملی طور پر نکاح کا یہ اسلامی تصور رخصت ہو چکا ہے، اس لیے آج کل کی تقاریب نکاح کی صورتحال کو خوردبین لگا کر بھی ملاحظہ کرنے سے پتہ نہیں چلتا کہ دین واسلام کا کوئی بابرکت عمل سرانجام دیا جارہا ہے۔

آغاز سے اختتام تک بدعنوانیوں، حق تلفیوں، بے جا و بے معنی رسومات کا ایک ایسا تکلیف دہ سلسلہ رہتا ہے کہ خدا کی پناہ! بدقسمتی سے ایک ایسا باعظمت عمل جو حقیقت میں ایک بڑے گناہ (زنا وبدکاری) سے حفاظت کا ذریعہ ہے اس کو آج کئی ایک گناہوں کے ارتکاب کے لیے ڈھال کے طور پر اختیار کیا جارہا ہے، خاص طور پر یہ چند مفاسد ایسے ہیں جن سے شاید ہی شادی کا کوئی گھرانہ محفوظ رہتا ہو۔

(۱) انتخاب کا غلط معیار: عام طور پر رشتہ کے انتخاب میں مال وجمال، حسب ونسب کو بنیادی اور ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جارہی ہے، دینداری گویا ان معیارات کے تابع بن گئی ہے بلکہ بہت سے خاندانوں کے یہاں لڑکے یا لڑکی کا دیندار ہونا نقص اور خامی سمجھی گئی ہے، پھر لڑکی کی مالداری پر ایسی نظر کہ روزِ اول ہی سے اس کی مال ودولت ہڑپنے کا استحقاق لے کر آئے ہیں، حسن وجمال کی ایسی جانچ کہ گویا کوئی مقابلۂ حسن ہو رہا ہے، حسب ونسب کی ایسی تفتیش کہ عکاظ کا میلہ لگا ہو، حالاں کہ حدیثِ پاک میں رشتہ کے انتخاب کا ترجیحی معیار بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے، ارشادِ مبارک ہے: چار چیزوں کی بنیاد پر عورت سے شادی کی جاتی ہے، مال ودولت کی بنیاد پر، حسب ونسب کی بنیاد پر، حسن وجمال کی بنیاد پر، دینداری کی بنیاد پر، تمہارا بھلا ہو، تم دیندار کو ترجیح دو (بخاری باب الاکفاء فی الدین: ۵۰۹۰)

(۲) جہیز اور جوڑے کی رقم: رشتہ کی بات آگے بڑھنے کے معاملہ میں یہ مرحلہ پلصراط کا

درجہ رکھتا ہے،لڑکے والے بے غیرتی سے فہرستِ جہیز در بدر لیے پھرتے ہیں، جس میں بے باکانہ طور پر ہر چھوٹی بڑی چیز درج رہتی ہے،شوہر کے پورے کنبہ کی ضروریات بلکہ خواہشات پوری ڈھٹائی کے ساتھ نمبروار تحریر ہوتی ہیں، جوڑے کی رقم کے تعلق سے باہمی تبادلۂ خیال اور مقدار کا تعین ایسا ہوتا ہے جیسے شادی نہیں کوئی سودا ہو رہا ہو، حد یہ کہ قرآن کی تعلیم تو اہلِ ایمان کے لیے یہ ہے کہ اگر کوئی ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری زوجہ اختیار کرنا چاہے اور پہلی زوجہ کو وہ اس سے قبل ڈھیر سارا مال دے چکا ہو تب بھی اس کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کو واپس لے لے،قرآن نے اس کو ناحق اور بطریقۂ گناہ لینے سے تعبیر کیا ہے،ارشادِ خداوندی ہے: اور اگر تم بجائے ایک بیوی کے دوسری بیوی کرنا چاہو اور تم اس کو انبار کا انبار مال دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی مت لو کیا تم اس کو لیتے ہو بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کے مرتکب ہو کر (سورۂ نساء: ۲۰) نفقہ، کسوۃ، سکنی، یعنی روٹی، کپڑا، مکان کے بندوبست وفراہمی کی مکمل ذمہ داری شریعت نے مرد پر رکھی ہے،قرآن شریف میں بڑے واضح ہدایات اس بارے میں موجود ہیں، افسوس ہے کہ آج کا مسلمان قرآنی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی متوقع بیوی اور اس کے سرپرستوں سے روزگار وذریعہ معاش کی فراہمی کا بھی مطالبہ کرتا ہے، رہائش گاہ کے بندوبست کا بھی ملتجیٔ ہوتا ہے،اور جہیز کی شکل میں اپنے ساتھ جملہ گرہستی کی اشیاء لانے کا بھی مرد مطالبہ رکھتا ہے،شاعرِ مشرق نے بجا کہا ہے ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(۳) بے جا و بے معنی رسومات: رشتہ کے طئے ہو جانے کے معاً بعد سے بے جا رسومات کے ایک طویل سلسلہ کا آغاز ہو جاتا ہے جو شادی کے بہت بعد تک چلتا رہتا ہے، پاؤں میز کا رسم، منجھے، سانچق، مہندی، چوتھی، جمعگی وغیرہ کے عنوانات سے بے شمار غیر اسلامی رسوم انجام دی جاتی ہیں، جن میں ظالمانہ طور پر وقت کے علاوہ پیسہ اور محنت ہر دو خرچ کئے جاتے ہیں، جب کہ یہی تین یعنی وقت، محنت اور پیسہ ایسے عوامل ہیں جن کی حفاظت و پاسداری کر کے دنیا کی اقوام، ترقی کے بامِ عروج اور اوجِ کمال پر پہنچ گئی ہیں اور مسلم دنیا، ان تینوں بیش بہا

عوامل کونظر انداز اور پامال کرتے ہوئے، معاشی اور معاشرتی طور پر قعرِ مذلت میں جا گری ہے، آج عالمِ اسلام کی معاشی صورتحال حد درجہ ناگفتہ بہ ہے، ڈاکٹر عبدالحمید غزال کے مطابق عالمِ اسلام میں غربت کا تناسب ۹۷؍فیصد تک پہنچ چکا ہے (روزنامہ منصف جمعہ ایڈیشن: ۷؍اکتوبر ۲۰۰۵ء) اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کرنے کے لیے ان لمبی چوڑی دعوتوں کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، یہ رسوم ورواج تو اسلامی مزاج کے سراسر خلاف ہیں، اسلامی شادی کا حاصل صرف اتنا ہے کہ ایک محفلِ عقد ہو جس میں ایجاب وقبول کا تبادلہ ہو، اظہارِ مسرّت کے طور پر کچھ چھوہارے لٹائے جائیں، شرعی حدود میں رہ کر کچھ مباح مظاہرے کرنے ہو تو کر لئے جائیں اور استطاعت ہو تو ولیمہ کا اہتمام کیا جائے، بس! تفصیل کا یہاں موقع نہیں، خود جناب رسالت مآب ﷺ اور صحابہ وصلحاء کی مجالسِ نکاح کے انعقاد کو ملاحظہ کر لیا جائے اندازہ ہوگا کہ وہ کس قدر سادگی وصفائی اور سہولت کے مظہر تھے، اس سلسلہ میں بنیادی طور پر یہ ارشادِ گرامی پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ سب زیادہ بابرکت نکاح وہی ہے، جس میں کم سے کم خرچ اور کم سے کم مشقت ہو (مسند احمد: مسند الصدیقہ عائشہ: ۲۴۵۲۹)

(۴) بارات، باجہ، گانا، بجانا، فلم بندی، آتش بازی وغیرہ: معاشرتی نقطۂ نظر سے شادی بیاہ کی مروجہ تقاریب کا یہ موڑ بڑا اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے، پیسوں کا بے تکا اسراف تو ہوتا ہی ہے، آن کی آن میں ہزاروں روپئے پٹاخے اور پھلجڑیوں کی شکل میں جلا کر خاکستر کر دیئے جاتے ہیں، باجے گاجے میں ہزاروں روپئے خرچ کئے ہی جاتے ہیں، تاہم جو جرم اس سے بھی سنگین نوعیت کا ہے وہ اللہ کی مخلوق کی ایذاء رسانی ہے، ایک بارات کی آڑ میں کئی ایک حقوق العباد بلکہ مخلوق کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں، باجے اور گانے بجانے کی گھن گرج سے نہ صرف انسانوں کا سکون وچین غارت کیا جاتا ہے بلکہ محلّہ میں بسنے والے بے زبان جانوروں کو بھی پریشان کیا جاتا ہے، راستے کے اور راہگیروں کے حقوق الگ پامال کئے جاتے ہیں، مسلمان کا ہرگز یہ شیوہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی زبان وعمل سے کسی انسان کو تکلیف پہونچے، رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ مسلمان تو وہ ہے جس کے قول وعمل (کی مضرت رسانیوں) سے تمام مسلمان محفوظ رہیں۔ پھر مذکورۂ بالا گناہ یعنی اسراف، باجہ، گانا بجانا، فلم

بندی، تصویر کشی وغیرہ کوئی ایسے گناہ نہیں ہیں جن کی قباحت اور حرمت پر بھاری بھرکم دلائل قائم کئے جائیں، کتاب وسنت میں جابجا صراحت کے ساتھ ان گناہوں کی مذمت بیان کی گئی ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں ارشادِ باری ہے: بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان رب کا بڑا ناشکرا ہے (آیت:۲۹) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ راگ اور گانا، دل میں نفاق کو (اسلام سے بغض کو دوری کو) ایسے ہی پیدا کرتا ہے جیسے پانی کھیت کو اگاتا ہے (مشکوۃ:۴۱۱) مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کردیا ہے مال کے ضائع کرنے کو (بخاری: باب اضاعۃ المال :۲۴۰۸) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت ترین عذاب کے مستحق تصویر بنانے والے لوگ ہیں (بخاری: باب عذاب المصورین:۵۹۵۰)

غرض اس وقت معاشرے کی محافل نکاح کو سدھارنے کی ضرورت ہے، انہیں پاکیزہ اور مطابق سنت بنانے کی ضرورت ہے، ان کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے کا موقع ہے، خاندان کے بزرگوں پر اور امت کے بہی خواہوں پر یہ وقت کا اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنے اثر ورسوخ، نصیحت وفہمائش، زبان وبیان کے ذریعہ نکاح کے اسلامی تصور کے احیاء کی کوشش کریں کہ ان کی جانب سے اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔

اسلامی نظامِ حدود کی بعض خصوصیات

شریعتِ اسلامیہ کا وہ شعبہ جو خاص طور پر موجودہ زمانہ میں اغیار کے حلق کا کانٹا اور ان کے بے جا طعن وتشنیع کا موضوع بن چکا ہے وہ اسلام کا نظام حدود وقصاص ہے، دشمنانِ اسلام کو اس کا بخوبی اندازہ ہے کہ معاشرے میں اس نظام کے برسرِعمل ہوتے ہوئے برائی کا سراُبھارنا ناممکن ہے، سماج پر جب تک اس نظام کی بالا دستی رہے گی عملاً جرائم کے پنپنے کی راہیں مسدود رہیں گی، اسلامی اقدار سے مسلم معاشرے کو بے لباس کرنے کے ان کے خطرناک عزائم شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکیں گے، یہ نتائج اور یہ مفروضے ظاہر ہے ایسے نہیں جنہیں بدی کے فروغ دینے والے ٹھنڈے دل گوارا کرسکیں، ان کے ناپاک منصوبوں کے پروان اور نشونما کے لیے تو ایک ایسا ماحول درکار ہے جس میں بجائے صالحیت کے عفریت کا اور روحانیت کے بجائے مادیت کا تسلط ہو اور جہاں حیا نہ صرف اپنی بیگانگی بلکہ رسوائی کا شکوہ کر رہی ہو، انسانوں کے اس بدخواہ گروہ نے قانونِ حدود وقصاص کو اپنی راہ کا ایک سخت جان روڑا سمجھا اور اس کو راستہ سے ہٹانے کے لیئے اپنے وجود اور اپنی تمامتر قوتوں کو جھونک دیا گئی ایک گوشوں سے اس کے مختلف دفعات وجزئیات کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اسے سراپا تحقیر وبے احترامیٔ انسانیت کا جلی عنوان قرار دیا گیا۔

ذیل میں اسلام کے نظام حدود وقصاص کی بعض خصوصیات وامتیازات کا جائزہ لیا جاتا ہے:

(الف) ثانویت کا پہلو: اسلامی نظام حدود کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ ان کو مذہب میں اساسی حیثیت نہیں دی گئی ہے، اسلام نے سارا زور اخلاقیات کے شیوع وپھیلاؤ پر صرف کیا ہے، اخروی جوابدہی کے عنصر کی آبیاری کی ہے، معاشرے میں صالح انسانی اقدار کے فروغ پر توجہ مرکوز رکھی ہے محکمۂ احتساب کے قیام اور سماج میں امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر کے عمومی مزاج کو پروان چڑھایا ہے، سزا وسرزنش کا حال اسلامی نقطۂ نظر سے عمل جراحی جیسا ہے جو جان لیوا ناسوروں کو اپنے انجام تک پہنچانے کے لیئے سخت ناگزیر ہو جاتا ہے، جن کو بدن سے دور کیئے بغیر صحت وحیات کی توقع فضول ٹھہرتی ہے، سورۂ حدید میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ہم نے اپنے پیغمبروں کو نشانیاں دے کر بھیجا ہے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور ترازو کو اُتارا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں (آیت: ۲۵) امام رازیؒ کے مطابق آیتِ مذکورہ میں گویا سنتِ خداوندی کو مرحلہ وار بیان کیا گیا ہے پہلے مرحلہ پر دلائل ومعجزات کے ساتھ بعثتِ رُسل ہے؛ پھر احکام وشرائع پر مشتمل نوشتۂ آسمانی کا اُتارنا ہے؛ پھر عدل وانصاف کے پیمانوں کی طرف رہنمائی ہے؛ پھر آلاتِ حرب کا استعمال اور اس کے فوائد کا بیان ہے (تفسیر کبیر ۲۹/۴۷۰) اسلام میں سزاؤں کی ثانویت اور بالکل لمحۂ اخیر میں ان کی مشروعیت کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے اپنے نہایت ہی پیارے، پروردۂ آغوشِ رسول ﷺ حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو کسی مہم پر روانہ فرمایا دورانِ جنگ ان کا کسی کافر سے سامنا ہوا ابھی انہوں نے تہہ تیغ کرنے کے ارادہ سے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ اس آدمی نے کلمۂ شہادت پڑھ دیا، حضرت اُسامہؓ نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا اور اُسے قتل کردیا، یہ قصہ جب بارگاہِ اقدس ﷺ میں پیش ہوا تو آپ ﷺ نے ان پر سخت گرفت فرمائی اور اس قدر ناراضگی ظاہر فرمائی کہ حضرت اسامہؓ کو رہ رہ کر یہ خیال آتا کہ کاش اس حرکت کے سرزد ہونے کے بعد میں اسلام لایا ہوتا تاکہ اسلام کی برکت سے میرا یہ عمل معاف ہوجاتا، آپ ﷺ نے بار بار اُن سے فرمایا تھا: اے اُسامہ کیا تم نے ایک آدمی کو کلمۂ شہادت پڑھ لینے کے بعد قتل کردیا تھا، حضرت اُسامہؓ نے عذر کیا کہ یارسول اللہ اس نے تلوار کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا، آپ ﷺ نے اس پر ارشاد فرمایا: کیا تم نے اس کا دل چیر کے دیکھا تھا کہ اس نے کلمہ کس نیت سے پڑھا تھا؟ (مسلم شریف مع الفتح:۲۶۱/۱)

(ب) اثر انگیزی وکارکردگی: ماہرینِ قانون کے مطابق، قانونِ انسدادِ جرائم کو جن

خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے، ان کا تجزیہ اختصار کے ساتھ یوں کیا جاسکتا ہے، عمومیت، کاملیت، فاعلیت، عمومیت کا مطلب یہ ہے کہ جرم کے دائرہ میں آنے والے ہر قول وفعل پر جرم کا اطلاق نیز اس پر پابندی لگائی گئی ہو، کاملیت کا مطلب یہ ہے کہ معاشرتِ انسانی کے اہم ستونوں یعنی سیاست، اجتماعیت، معیشت سے متصادم جرائم پر خاص طور پر سزائیں مقرر کی گئی ہوں، فاعلیت کا مطلب یہ ہے کہ جن اغراض واہداف کے پیش نظر قواعد وقوانین بنائے گئے ہیں، وہ بالفعل حاصل بھی ہورہے ہوں یعنی قوانینِ انسدادِ جرائم ثمر آور بھی ثابت ہورہے ہوں، دنیائے قانون کے ماہرین کے وضع کردہ ان اصول وامتیازات کا موازنہ جب ہم اسلامی نظام عقوبات سے کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ اسلامی نظام عقوبات میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں بلکہ بعض زاویوں سے وہ برتر وفائق ہی نظر آتا ہے، اسلام کا نظام عقوبات، جرائم کی تمام ہی ممکنہ جزئیات پر حاوی ہے، فرد یا جماعت سے متعلق حق تلفی کی کوئی صورت ایسی نہیں رہ گئی جسے اسلام نے حرام یا منع نہ کیا ہو اور دنیوی یا اخروی عقاب کے ذریعہ ڈرایا دھمکایا نہ ہو، بغاوت، ڈاکہ زنی، سرقہ، بدکاری، تہمت، اغوا کاری، لوٹ مار وغیرہ جیسے سنگین جرائم پر نہایت ہی عبرتناک سزائیں جاری کر کے معاشرہ کے اہم ستونوں کے تحفظ وبقا کا سامان کیا ہے، مجرم کی صلاح وسدھار سے متعلق تمام تدابیر کو بروئے کار لاتے ہوئے جرم کرنے والے کو اس قابل کیا کہ وہ دوبارہ سماج کے دھارے میں شامل ہوسکے اور اپنے افعال پر نادم وپشیمان ہوسکے یا کم از کم جرم کرنے سے باز آجائے اور دوسروں کے لیئے نمونۂ عبرت بن سکے۔

اسلام کی مقرر کردہ سزاؤں میں مجرم کے بگڑنے یا مزید جری ہونے کے مواقع نہ ہونے کے درجہ میں ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ اول تو اسلام میں ایسی طویل مدتی سزائیں اصولی طور پر موجود ہی نہیں جو مجرمانہ ذہنیتوں کے اکٹھا ہونے کا موقع فراہم کرتی ہیں اور برائی کے جرثوموں کو استحکام بخشتی ہوں، مروجہ قوانین سزا وتعزیرات کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں مجرمانہ عناصر کی بیخ کنی کے بجائے ان کی آبیاری کا ماحول مہیا کیا جاتا ہے، قید وبند یا حبس کی سزا جو اس وقت پوری دنیا میں اصولی اور ترجیحی طور پر رائج ہے، اس کا بڑا نقص اور خامی یہی ہے جب کہ اسلامی قانون کی رو سے اس طرح کی سزا کی نوعیت عارضی

واستثنائی ہے؛ اسلام کی نظر میں ایسا مجرم جو اپنے جرم کی سزا پا چکا ہے، مردود یا قابل نفرت نہیں بلکہ اگر خود مجرم نے جرم کا احساس کرتے ہوئے دعوی یا مقدمے کے بغیر ہی اپنے اوپر حد جاری کرانے میں پہل کی ہے تو اس کا یہ جذبہ واحساس حد درجہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے، رسالتمآب ﷺ کے زمانے میں اکا دکا جو جرائم وقوع پذیر ہوتے تھے، ان کے سلسلہ میں عام مزاج یہی بنے ہوئے تھے کہ مجرم خود پہل کر کے اپنا داغ اور اپنا گناہ دھلانے کی فکر کرتے تھے؛ انہی جیسے نیک نفس لوگوں کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک امت پر اس کو بانٹ دیا جائے تو سب کے لئے کافی ہو جائے (مسلم: باب من اعترف علی نفسہ بالزنا: ۱۶۹۵) اور اگر مرافعہ ومقدمہ کے بعد اس پر حد جاری کی گئی ہے تب بھی اس کی ذات اس لئے قابل نفرت نہیں کہ اسے اب معاشرہ کی نصح وخیر خواہی کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ جن مجرمانہ جذبات سے مغلوب ہوکر اس نے جرم کا ارتکاب کیا تھا وہ اس کے مزاج سے نکل جائیں۔

(ج) جلد بازی سے گریز: سزاؤں کے نفاذ میں اسلام نے جلد بازی پسند نہیں کی ہے، استغاثہ کی جانب سے ٹھوس ثبوت اور بینات کے داخل کرنے کے بعد ہی قوت نافذہ حرکت میں آسکتی ہے، ناکافی ثبوت کی بناء پر اسلامی شریعت میں نہ کبھی کسی حد کا فیصلہ اب تک کیا گیا ہے اور نہ ہی آئندہ اس کی اجازت ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشادِ گرامی ہے:

ادرؤ الحدود بالشبهات ادفعوا القتل عن المسلمين مااستطعتم

(**تحفةالاحوذی: باب ما جاء فی درء الحدود ۴/۵۷۳**) شبہات ہوں تو حدود کو ساقط کر دو اور مسلمانوں سے جہاں تک ہو سکے قتل کو دور رکھو، شریعتِ اسلامیہ میں خاص طور پر حدود کے معاملہ میں اصلی سزاؤں کے اسقاط کی حد تک، شبہ کا فائدہ مجرم کو دیا جاتا ہے، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ ایک انسان تو بہر حال جرم کا شکار ہو چکا ہے، ناکافی ثبوت کی بناء پر مشتبہ مجرم کو سزا دینے میں اس کا بھی امکان ہے کہ دوسرا آدمی بھی اذیت کا شکار ہو جائے، رسول اللہ ﷺ کا ایک اور ارشادِ گرامی ہے کہ: مسلمانوں سے جہاں تک ہو سکے حدود یعنی سزاؤں کو گرادو؛ اگر تمھیں کوئی سبیل نظر آئے تو ملزم کا راستہ چھوڑ دو؛ کیوں کہ یہ بات سب سے بہتر

ہے کہ جہاں کم سزا دینے میں غلطی کر جانے کے بجائے معاف کرنے میں غلطی پر ہو (ترمذی:باب ما جاء فی درء الحدود: ۱۴۲۴)

چنانچہ اسلامی فقہ میں ایسی جزئیات بکثرت ملتی ہیں کہ جہاں متوقع صورتوں کوفرض کر کے شرعی مسئلہ بتلایا گیا ہے، مثلاً یہ کہ کوئی نیا نیا مسلمان یا مسلم ماحول سے دور رہنے والا انسان حرمت ومعصیت سے لاعلمی کی بناء پر چوری یا زنا یا شراب نوشی کرے تو اس پر حد عائد نہیں کی جاتی، ایسے ہی اگر کوئی قرضدار مقروض کے مال سے اپنے قرض کے بقدر رقم کو چرالیتا ہے تو اس پر حد سرقہ کا نفاذ نہیں ہوتا، اسی طرح بیوی یا شوہر ایک دوسرے کے اموال بلا اجازت لے لیں تو یہ بھی سرقہ نہیں کہلائے گا (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵۳۰۷/۷) ایسے ہی مجرم نے اگر اپنے دفاع کی خاطر یا کسی واقعی ضرورت سے مجبور ہوکر جرم کا ارتکاب کیا ہے تب بھی اس پر سزاؤں کا نفاذ نہیں ہوگا، حضرت عمرؓ کا مشہور تعامل ہے کہ آپؓ نے قحط سالی کے زمانے میں چوروں سے قطع ید کی سزا موقوف کردی تھی (أعلام الموقعین: ۱۳/۳) اسی طرح سورۂ نور کی آیت: ۳۳/ کے پیشِ نظر جمہور فقہاء کا موقف یہ ہے کہ زنا بالجبر کی شکار خاتون پر کوئی سزا نہیں ہے (الفقہ الاسلامی: ۵۳۳۹/۷) اور حاکم وقت کی جانب سے گرفتاری وقابو یافتگی سے قبل، ڈکیت پیشہ افراد کی خودسپردگی سے حد حرابہ یا ڈاکہ زنی کی حد کا ساقط ہو جانا، خود قرآن میں منصوص ہے (المائدۃ:۳۴)

(د) شرائطِ ثبوتِ جرم بمطابق نوعیت جرم: عام مسائل عبادات ومعاملات کے برخلاف حدود کے مقدمات میں شرائط اثباتِ جرم سخت رکھی گئی ہیں عبادات ومعاملات میں عورتوں کی گواہی کو بھی روا رکھا گیا ہے، عدد وعدالت سے متعلق کوئی غیر معمولی قیود وپابندیاں عائد نہیں کی گئی ہیں؛ حتی کہ نفسِ انعقاد نکاح کے لیئے غیر عادل گواہوں کی موجودگی بھی کافی سمجھی گئی ہے، فقہ کے مخصوص قانونی الفاظ میں: غیر عادل گواہوں کو تحمل شہادت کا تو اہل تسلیم کیا گیا ہے اداءِ شہادت کا نہیں، جب کہ حدود میں عورتوں کی گواہی سرے سے نا قابل قبول قرار دے دی گئی، عدد وعدالت کو انتہائی ناگزیر شرط قرار دیا گیا بعض خارجی قرائن کا بھی لحاظ کیا گیا، مثلاً شراب نوشی کا مقدمہ گواہوں کے واسطہ سے قاضی کے پاس پیش ہوتا ہے تو علاوہ کم

ازکم دو عادل گواہوں کی شرط کے بعض فقہاء کے یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ مئے نوشی کا اثر تا حال مئے نوش کے منہ میں باقی رہا ہو، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گواہ کے ذریعہ مئے نوشی کا اثبات اور اس پر حد شرب کا نفاذ کس قدر مشکل ترین اور غیر معمولی سرعت کا متقاضی امر ہے۔

رجم کی سزا، جسے بالخصوص ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے اور جس کے سلسلہ میں غیروں کے علاوہ خود اپنوں کا ایک طبقہ شدید شکوک وشبہات میں مبتلا ہے، اس کی شرائط اثبات اس قدر کڑی اور اس کے اندراجات اس قدر بھاری ہیں کہ قانونِ اسلامی کی تاریخ میں اس طرح کے فیصلے شذوذ واستثنا کے دائرہ ہی میں آتے ہیں، اگر اقرار و پہل خود مجرم کی جانب سے ہوتی ہے تو اس کے کردار وعمل اس کے ذہن وعقل کے توازن اوقات وحالات کے تقاضے، جرم کے ارتکاب کے ماحول ومحرکات کا پوری باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد، مجرم سے کھلے انداز میں مکمل گفت وشنید کرنے اور چار دفعہ اعترافِ جرم کرنے کے بعد ہی حد جاری کی جاتی ہے۔

زمانۂ رسالت ﷺ میں حضرت ماعزؓ کے زنا وسنگساری کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ کتبِ احادیث میں محفوظ ہے، بیشتر روایات ان سوالات کی پوری تفصیل بیان کرتی ہیں جو آنحضرت ﷺ نے سزائے رجم سے پہلے ان سے پوچھے تھے، کیا تم مجنون ہو؟ کیا تم شادی شدہ ہو؟ کیا تم نے واقعی اس سے مباشرت کی ہے؟ جانتے بھی ہو کہ زنا کیا ہوتا ہے؟ شاید تم نے صرف بوس وکنار کی ہو؟ اس قسم کے بہت سے سوالات صحیح احادیث میں موجود ہیں (عدالتی فیصلے: ۱/۵۹) اور اگر جرم کا ثبوت گواہوں کے ذریعہ ہوا ہے تو اول تو تمام قضایا کے برعکس دو کے بجائے چار گواہوں کی ضرورت پڑتی ہے، منصوص طور پر چار گواہوں کی صراحت خود قرآنِ کریم میں بھی مذکور ہے؛ پھر اس کے بعد گواہوں پر سخت جرح اور ان سے صورتِ حال کی پوری تحقیق کی جاتی ہے، انسانی جان کی عظمت کی خاطر، اشارے اور کنایوں کے حجاب کو ہٹا دیا جاتا ہے اور پوری صراحت کے ساتھ گواہوں سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم نے اس طرح ان کو زنا کرتے دیکھا ہے جس طرح کہ سلائی سرمہ دانی میں اور رسی ڈول میں اترتی

ہے، ان نزاکتوں اور باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا اس کا امکان ہو بھی سکتا ہے کہ عملی اعتبار سے ایک صالح معاشرہ میں جرم زنا کا اثبات شہادت کے ذریعہ ہوسکتا ہے؟؟ اس لیئے یہ کہنا تو قطعاً بے جا و نادرست ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا کا عملی نفاذ بآسانی یا بار بار ہوتا ہے۔

رہا اقرار کے ذریعہ، کوئی مخلص بندہ، اپنے اوپر حد جاری کرانا چاہے اور اللہ کے امر کی خاطر سنگسار ہونے پر تیار ہو جائے تو یہ اس کا اپنا معاملہ اور رب کے حضور اس کی اپنی قربانی ہے، آخر آج نام نہاد دیوتاؤں کے تقرب کی خاطر کتنے معصوموں کو موت کی بھینٹ نہیں چڑھا دیا جاتا ہے اور دنیا چپ رہتی ہے؛ اگر کوئی بندہ اپنی خوشی سے اپنے حقیقی مولی پر قربان ہونا چاہتا ہے تو کسی کو کیوں اعتراض ہوتا ہے، آج معصوم انسانوں کو اذیت وتکلیف کے کن کن ہیبت ناک طریقوں سے موت کے گھاٹ نہیں اتارا جاتا؛ اگر کوئی بندہ اپنی پوری رضامندی وآمادگی کے ساتھ جرم کے داغ کو دھلوانا چاہتا ہے تو اس کو اور دھلوانے میں اس کی مدد کرنے والوں کو کیوں بدنام کیا جاتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جس معاشرے سے حیا رخصت ہوچکی ہو، ناموس وعصمت کا تصور مٹ چکا ہو، گناہ کے گناہ ہونے کا تصور ختم ہو چکا ہو، وہاں یہ سزا یقیناً غیر معمولی معلوم ہوگی لیکن جس معاشرے میں حیاء وشرم کی قدریں پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہوں اور رجم کی سزا سے زیادہ ہولناک ودردناک عذاب کا عقیدہ دل ودماغ پر چھایا ہوا ہو وہاں یہ سزا نہ مجرم پر بھاری ہوگی اور نہ معاشرہ اس کو برا سمجھے گا۔

(ہ) بوقتِ نفاذ بعض ہدایات: جیسا کہ سابق میں بتایا جاچکا ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے حدود وقصاص کے نفاذ کا مرحلہ انتہائی ناگزیر حالات کے تابع ہے کہ جہاں اس کے سوا کوئی اور سبیل اور ذریعہ اصلاح نہیں رہ جاتا وہیں اس کو اختیار کیا جاتا ہے جس طرح کہ اہل عرب کا سابق میں عرف تھا کہ مرض کی شفایابی میں جب تمام دوائیں بے اثر ثابت ہوتی ہیں تو داغنے کے علاج کو اختیار کیا جاتا تھا، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ حد کا قائم کرنا جہاد فی سبیل اللہ کی طرح عبادات ہی کے شعبہ سے ہے اس لیئے یہ بات جاننی چاہیے کہ اقامتِ حدود، دراصل بندوں پر خدا کی مہربانی ورحمت ہے پس حاکم کو چاہیئے کہ وہ حد کے قائم کرنے میں بے جا مسامحت نہ برتے، خدا کی شریعت میں غیر مجاز نرمی کا مظاہرہ کرکے اقامت حدود کے

نظام کو غیر کارکردنہ کرے، خلق اللہ پر مہربانی اس کا شیوہ رہے اقامت حدود کے ضمن میں اس کا مقصودِ نظر لوگوں کو معاصی و منکرات سے روکنا ہوا قامتِ حد کے سلسلہ میں اس کی مثال اس شفیق باپ کی سی ہونی چاہئے جو ماں کے روکنے اور التجا کرنے کے باوجود نا گوار خاطر اپنے بیٹے کو بری حرکت پر سزا دیتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس موقع پر بچے کی مناسب تادیب اس کی آئندہ زندگی کی تعمیر کر سکے گی (الفقہ الاسلامی: ۷/۵۳۱۶)

حد زنا چاہے سنگساری کی صورت میں ہو یا کوڑے مارنے کی صورت میں انسانی شرافت کا بہرصورت پاس رکھا جاتا ہے اور انصاف کے تقاضوں سے سرموتجاوز نہیں کیا جاتا جرم زانی یا زانیہ کا ہوتا ہے حمل بہرحال معصوم ہوتا ہے اس لیئے سزا کی زد پڑنے سے اسے دور رکھا جاتا ہے، حضرت غامدیہؓ نے جب خود آکر سنگساری کی درخواست کی اور حمل سے تھیں تو آپ ﷺ نے تاکید کے ساتھ انہیں واپس فرمادیا اور ولادت کے بعد آنے کو کہا پھر ولادت کے بعد مولود کی شیر خوارگی کی عمر پوری ہو جانے تک حد کو مؤخر فرمادیا، آخر جب وہ خود سے روٹی کھانے کے قابل ہوا تو آپ ﷺ نے حد جاری فرمائی (مسلم: باب من اعترف علی نفسہ بالزنا: ۱۶۹۵) حد قائم کرتے وقت مجرم کی ستر پوشی کا پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ اس امت میں برہنگی کی سزا نہیں ہے (السنن الکبری للبیہقی: باب ماجاء فی صفۃ السوط والضرب: ۱۷۵۷۷) نہ بالکل معمولی پتھروں سے سنگسار کیا جاتا ہے کہ جان نکلنے میں دیر لگے اور مجرم کو غیر ضروری مشقت اُٹھانی پڑے اور نہ ہی یکبارگی بڑے حجم کے پتھروں سے مارا جاتا ہے کہ سزا و عبرت کے معنی ہی فوت ہو جائیں، متوسط پتھروں سے اسے سنگسار کرنے کا حکم ہے۔

جان نکلنے کے بعد ایسا کوئی مسئلہ نہیں کہ مجرم اچھوت ہو گیا ہو کہ ہاتھ لگانا بھی پاپ بن جائے درحقیقت وہ ایک جواں ہمت انسان ہے جس نے امر شریعت پر جان نثار کردی، عام اموات کی طرح اسے غسل دیا جائے گا کفن پہنایا جائے گا، نماز جنازہ پڑھی جائے گی احترام سے دفن کیا جائے گا، حضرت غامدیہؓ کی سنگساری کے دوران اُن کے بدن سے خون کی کچھ چھینٹیں اُڑ کر حضرت خالد بن ولیدؓ پر آپڑیں، حضرت خالدؓ کا چہرہ اور لہجہ بدل گیا اس پر آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملے فرمائے: خالد! باز رہو اس حوصلہ مند خاتون نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر لوگوں سے جبری معمول وصول کرنے والا ظالم بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا (مسلم: باب من اعترف علی نفسہ بالزنا: ۱۶۹۵) اور حضرت ماعزؓ کے تعلق سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: انہوں نے ایسی توبہ کی کہ اگر وہ ایک امت کے درمیان بانٹ دی جائے تو ان کے لیئے کافی ہو جائے (حوالۂ سابق) کوڑوں کی سزا کے معاملے میں مزید احتیاط برتنے کی تاکید کی گئی چوں کہ اس سزا میں مجرم کی جان لینا ہدف نہیں ہوتا بلکہ جسمانی اذیت پہنچانی مقصود ہوتی ہے، اس لیئے ہر ایسی حرکت جو بجائے جسمانی اذیت کے ہلاکتِ جان کا سبب بنے ممنوع ہے؛ چنانچہ سخت گرمی یا سخت سردی کے عالم میں یہ سزا قائم نہیں کی جائے گی کہ ہوسکتا ہے کہ دھوپ کی تمازت اور کوڑوں کی گرمی کی تاب نہ لاکر مجرم کی جان ہی نکل جائے یا خارجی برودت اور مار کے دوگانہ اثر سے معاملہ بگڑ جائے اور موت واقع ہو جائے ایسے ہی بیماری حمل اور نفاس کی حالت میں بھی مجرم پر حد کا قائم کرنا شرعاً جائز نہیں۔

کوڑے مارنے کے سلسلہ میں جلاد کو یہ تاکید کی گئی کہ کوڑا مارنے میں ہاتھ سر سے اونچا نہ اُٹھائے حضرت عمرؓ وعلیؓ اور ابن مسعودؓ سے یہ ثابت ہے کہ ان حضرات نے جلاد سے یہ بات کہی ہے کہ ہاتھ اتنا اُٹھا کر مت مار کہ تیرے بغل کی سپیدی نظر آنے لگے، ایک ہی عضو پر متواتر نہیں مارا جائے گا کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ حصہ ہی بے کار ہو جائے یا اس کی جلد پھٹ جائے، کوڑوں کی مار کو شانوں، بازؤں، ہاتھوں، پیروں، پنڈلیوں پر تقسیم کیا جائے گا، بدن کے نازک یا حساس حصوں سے بچا جائے گا، چہرے، سر، سینہ، پیٹ، اعضائے تناسل وغیرہ پر کوڑے نہیں مارے جائیں گے، حضرت علیؓ کا جلاد سے کہا گیا یہ فرمان محفوظ ہے کہ مار اور ہر حصے کو اس کا مناسب حق دے البتہ چہرے اور اعضائے تناسل پر مارنے سے باز رہ (الفقہ الاسلامی: ۵۳۹۰/۷) کوڑے کی اس اسلامی سزا کے بارے میں اب اس اعتبار سے کوئی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں رہی کہ خود مغرب کے ہمنوا بھی اس کی افادیت تسلیم کر چکے ہیں بلکہ بعض مغربی ممالک نے عملی طور پر اس کا نفاذ بھی کیا ہے ''انگلینڈ نے اپنے فوجداری اور فوجی قوانین، مصر نے اپنے فوجی قوانین اور امریکہ نے قیدیوں کے جرائم میں

کوڑے کو بنیادی سزا کے طور پر تسلیم کیا ہے، دوسری جنگِ عظیم کے بعد تقریباً تمام ہی ملکوں نے بعض ایسے جرائم جن کی زد انتظام یا امن عامہ پر پڑتی تھی ان کی سزا کوڑا متعین کیا؛ بہرکیف عالمی طور پر یہ تسلیم کیا گیا کہ اس باب میں کوڑے سے زیادہ کوئی بھی سزا کارآمد نہیں ہے اور ضمناً اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ جرائم کا صفایا کرنے کے لیئے اسلامی قوانین کی نظیر نہیں ہے(**التشریع الجنائی بحوالۂ نعمت المنعم: ۲۸۴**)اسلامی نظام حدود کا تقابل جب ہم دیگر مذاہب کے قوانین نظم وضبط سے کرتے ہیں تو بے اعتدالی، افراط وتفریط بے جائیت، تعصب وامتیاز کا بدترین فرق صاف نظر آتا ہے، ہندوازم جس کو ہمارے ملک کے اکثریتی فرقے کا مذہب ہونے کا فخر حاصل ہے، اس میں محض نسلی امتیاز کی بناء پر معمولی جرائم یا ان جرائم پر جن کو جرائم کا نام دینا بھی اسلامی قانون کی رو سے جرم ہے، ایسی ایسی سزائیں روا رکھی گئی ہیں کہ جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور جن کو بجائے سزا کے استحصال وسفاکیت کا نام دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، چند دفعات ملاحظہ ہوں:

''ایک شودر اگر دوِج کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے''(منو: ۲۷۲/۸)''جو ادنیٰ ترین ذات کا آدمی (شودر) اعلیٰ ترین ذات کے آدمی (برہمن) کے برابر بے ادبی سے ایک ہی جگہ بیٹھ جائے، اس کے پچھلے حصہ پر نشان لگا کر راجہ یا تو اس کو ملک بدر کردے یا اس کے سرین کٹوادے''(منو: ۲۸۱/۸)

''اگر وہ برہمن پر غرور سے تھوک دے تو راجہ اس کے دونوں ہونٹ کٹوادے؛ اگر وہ اس پر پیشاب کرے تو اس کی شرمگاہ کو قطع کرادے؛ اگر وہ برہمن کی طرف گوز (ریح) صادر کرے تو اس کی جائے مخصوص کٹواڈالے(۲۸۳/۸)(الجہاد فی الاسلام: ۳۷۱)

یہ مذکورہ بالا تفصیل وتشریح، اسلامی قانون وسیاست کی برتری وجامعیت اور اسلام کی انسانیت نوازی کے وصفِ خاص کو سمجھنے کے لیئے کافی اور چشم کشا ثابت ہوگی۔

شرعی سزاؤں پر ایک بے بنیاد الزام

اباحیت پسندوں کی جانب سے شرعی حدود وقصاص کے نظام پر یہ قدیم الزام بار بار تھوپا جاتا ہے کہ یہ حد درجہ قساوت وسنگدلی پر مبنی ہیں، فردِ جرم ثابت ہونے کے بعد مجرم کو بڑی بے رحمی کے ساتھ سزا دی جاتی ہے اور کسی طرح کی رو ورعایت ملحوظ نہیں رکھی جاتی، جرم کی حوصلہ افزائی کی یہ ذہنیت ایسا نہیں کہ صرف اہلِ مغرب یا بزعمِ خود حریت کے دعویداروں کی ہے بلکہ یہ احساس بعض مخصوص حدود کے سلسلہ میں خود ہمارے اپنے حلقوں میں بھی گشت کر رہا ہے، غالبًا یہی منفی محرکات وعوامل ہیں، جنہوں نے بعض نامور اہلِ علم کو خاص طور پر رجم یعنی سنگساری کی سزا کے سلسلہ میں معتذرانہ موقف اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے، مثال کے طور پر صاحبِ تدبر قرآن نے اصولی طور پر اسلام میں رجم کی سزا کے ثبوت کو تسلیم کیا ہے، لیکن اس پر بڑا زور صرف کیا ہے کہ یہ سزا عام شادی شدہ بدکاروں کی نہیں بلکہ عادی اور پیشہ ور زناکاروں کی ہے، اپنے اس خود ساختہ اور جمہورِ امت کے مخالف نظریئے کو ثابت کرنے میں وہ اس قدر آگے بڑھ گئے کہ مقامِ صحابہ تک کا لحاظ نہیں کیا، بعض بے بنیاد قسم کے دلائل اور بعض مجمل اشارات کا سہارا لے کر صحابیٔ رسول ﷺ حضرت ماعز اسلمیؓ اور صحابیۂ رسول حضرت غامدیہؓ کے دامن کو داغدار کرنے کی نامبارک سعی کی اور ان مبارک نفوس کی شان میں ایسے نازیبا اور عامیانہ قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں کہ ان کا نقل کرنا بھی بس کی بات نہیں (ملاحظہ ہو: تدبر قرآن: ۳۶۴/۵، ۳۷۴ سورۂ نور)

یہ بالکل بے غبار بات ہے کہ جمہور امت کے یہاں رجم کی سزا، زانیٔ محصن (شادی شدہ) کے لیے ایک شرعی سزا کے طور پر ہے تقریباً ۵۲ صحابہ سے رجم کے سلسلہ میں روایات مروی ہیں (ملاحظہ ہو: **تکملہ فتح الملهم**: ۴۱۹/۲) اجماعی نقطۂ نظر سے رجم کی سزا کی نوعیت سیاسی نہیں بلکہ شرعی ہے اور اس کا مدار زانی کے محصن ہونے یا نہ ہونے پر ہے نہ کہ زانی کے عادی اور غیر عادی ہونے پر۔

جو شخص اسلامی معاشرت اور فردِ مسلم کے فلسفۂ زندگی سے واقف ہو کہ جس میں برائی کی سرحدوں سے بھی دوری کا سامان فراہم کیا جاتا ہے اور اسلامی معاشرت کے مثبت اصول بذاتِ خود یہ ماحول مہیا کرتے ہیں کہ دور دور تک برائی کے دواعی اور محرکات پر طبعی روک لگی ہوتی ہے، ایسے میں کسی سے اگر اخلاقی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو خواہ وہ کتنے ہی بشری تقاضے سے مغلوب ہو کر ہو، بہرحال ایک ایسا گناہ ہے جس کے لیے رجم کی سزا واقع میں بھی اور ایک باشعور و ہوشمند انسان کی نظر میں بھی کوئی غیر معمولی یا زائد از جرم سزا نہیں، بنیادی طور پر اسلامی سزاؤں کے متعلق سب سے پہلے حاشیۂ خیال سے یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہئے کہ ان کے اجراء کا مقصد خدانخواستہ کوئی مجرم سے انتقام لینا نہیں ہے انتقام کے مفہوم اور حد کے معنی کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے، انتقام خالص دل کی آگ بجھانے کے لیے لیا جاتا ہے جب کہ حد کے تمامتر معنی مجرم کی صلاح وسدھار اور انسانی معاشرہ کے تحفظ کی ضمانت کے ارد گرد گھومتے ہیں وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَااُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرة: ۱۷۹) عقلمندو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے اس باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے، اسلام نے مجرم کے لیے ایسی سزائیں تجویز کی ہیں جو جرم کے سدباب اور مجرم کی اصلاح میں تیر بہدف ہیں، نہ ہی ایسی کوئی بات ہے کہ معمولی جرم پر غیر معمولی سزا مقرر ہو اور نہ ہی یہ جھول موجود ہے کہ غیر معمولی جرم پر برائے نام سزا تجویز کی گئی ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی یہ خاص رحمت اور فضل کی بات ہے کہ انسانوں کے مابین رونما ہونے والے مختلف جرائم ومظالم پر مناسب سزائیں مقرر ہیں، جو اپنی جامعیت کی بناء پر ایک طرف تو جرائم کے سدباب میں نہایت ہی موثر اور مکمل ترین ہیں اور دوسری طرف مجرم کے قضیہ میں نہایت ہی اعتدال پسندی پر مبنی ہیں، اسلامی سزاؤں میں اس سفاکیت کا کوئی تصور نہیں کہ کذب وغلط بیانی پر زبان ہی اکھاڑ لی جائے یا بدکاری پر حیاء دار عضو ہی سے محروم کر دیا جائے یا سرقہ میں سارق کا وجود ہی مٹا دیا جائے بلکہ حدودِ شرعیہ اپنے مخصوص خدوخال میں اس امر کی ضامن ہیں کہ معاشرے سے ظلم وزیادتی اور بدنظمی وبدامنی کی فضا واقعۃً دور ہو جائے (ملخص از الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵۳۱۲/۷) اسلامی نظامِ

حدود میں تحفظ عامہ کی روح ہر جہت سے کارفرمانظر آتی ہے،عبادات کے سلسلہ میں کی جانے والی کوتاہیوں یا معاملات کی آڑ میں کیئے جانے والے اخلاقی مفاسد پر اس قدر داروگیر نہیں، جس قدر سختی تحفظِ عامہ سے متصادم افعال کے ارتکاب پر شریعتِ اسلامیہ میں پائی جاتی ہے، متعینہ ومقررہ حدود صرف انہی جرائم کے سلسلہ میں ملتے ہیں، جو معاشرتی مفاد سے متصادم ہیں، فقہاء امت انہیں حقوق اللہ یا حقوق الجماعۃ یا مقومات المصلحۃ سے تعبیر کرتے ہیں، معاشرتی اعتبار سے ایک انسان کو زیست کے جن اصولوں کی ضمانت ملنی چاہیے، انہیں فقہی اصطلاح میں مقاصدِ شریعت یا اصول کلیہ خمسہ کہا جاتا ہے، جن کی تفصیل اس طرح ہے: عقیدہ ودین کی حفاظت، جینے کے یعنی جان کے حق کی حفاظت، عقل کی حفاظت، عصمت وعفت اور نسل کی حفاظت، مال وجائیداد کی حفاظت (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵۳۱۸/۷)

حدودِ مقررہ، دراصل انہی مقاصدِ کلیہ کے محافظ وضامن ہیں، مثلاً حدارتداد، عقیدہ ودین کی حفاظت بہم پہنچاتی ہے، قصاص ودیت کا قانون جان کی حفاظت کرتا ہے، حدشرب یعنی شراب نوشی پر عائد کردہ حد، عقل کے بگاڑ کو لگام دیتی ہے، حدقذف وحدزنا، عصمت ونسل کے تحفظ کی ضمانت مہیا کرتی ہے، حدسرقہ وحرابہ (بغاوت ولوٹ مار) املاک وجائیداد کا تحفظ فراہم کرتی ہے، اسلامی قانونِ سزا میں ان متعینہ سزاؤں کی حیثیت، دستور کے بنیادی دفعات کی سی ہے، جن کا ذراسا جھول اور معمولی لچک بھی پورے قانون کو بے اثر کر کے رکھ دیتی ہے، اس لیے شریعت نے سزاؤں کے اس خانہ میں کسی طرح کی رأفت ورحمت اور نرمی گوارا نہیں کی ہے، بلا کسی رعایت وتفریق کے یہ سزائیں ایک ذی حیثیت اور ایک بے حیثیت پر، شریف پر، رذیل پر، عالی نسب پر، فاقد النسب پر، نافذ کی جاتی ہیں۔

خاص انہی سزاؤں کے بارے میں یہ قرآنی ارشاد وارد ہے **وَلَاتَاخُذُكُمْ بِهِمَا رَافَةٌ فِی دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِر** (سورۃ النور:۲) ان پر اللہ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمھیں ہرگز ترس نہ کھانا چاہئے، اگر تمھیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جلالی ارشادِ گرامی بھی اسی بابت ہے **وَأیْمُ اللّٰهِ لَوْ ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدها** خدا کی قسم اگر فاطمہؓ

بنت محمد (ﷺ) بھی بالفرض چوری کرتیں تب بھی میں ان کے ہاتھ ضرور کاٹ دیتا (**مسلم شریف مع التکملة: ۲/۴۰۱**) البتہ ان کے سوا دیگر جرائم پر جو سزائیں ہیں ان کا تعلق اسلامی قانونِ تعزیر سے ہے جن میں کسی قدر لچک رکھی گئی ہے، حاکم وقت کے لیے یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ جرم کی نوعیت، مجرم کی حالت، واقعہ کی کیفیت، نیز ظروفِ زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے تنہا اپنی یا اہلِ شوریٰ کی صوابدید کے مطابق ہلکی یا بھاری سزا تجویز کرے۔

سزاؤں کے جاری کرنے کا اولین مقصد چوں کہ مجرمانہ ذہنیتوں کی اصلاح اور مفادِ عامہ یا مقاصدِ شریعت کا تحفظ ہے، اس لیے خاص طور پر مفادِ عامہ سے ٹکرانے والے جرائم پر سزائیں نسبتاً سخت رکھی گئی ہیں، نیز ان سزاؤں کے برسرِ عام نفاذ کا مطالبہ کیا گیا تاکہ جرائم پیشہ افراد اس انجام کا نظارہ کرکے اپنے برے ارادوں سے باز آسکیں اور انسانی معاشرہ پر علی الاعلان مفادِ عامہ کی اہمیت واضح ہوسکے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **وَلْيَشْهَدْ عَذابهما طائفة من المؤمنين** (سورة النور: ۲) ان کی (بدکاری کرنے والوں کی) سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہئے۔

تاکہ سزا کا اصل مقصد کہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں، زیادہ وسیع پیمانے پر حاصل ہوسکے، بدقسمتی سے آج کل برسرِ عام سزا کو انسانی حقوق کے خلاف باور کرایا جارہا ہے، یہ سراسر جہالت، احکامِ الٰہی سے بغاوت اور بزعم خویش اللہ سے بھی زیادہ انسانوں کا ہمدرد اور خیرخواہ بننا ہے، دراں حالیکہ اللہ سے زیادہ رؤف ورحیم کوئی نہیں (قرآنِ کریم مع اردو ترجمہ وتفسیر: ۹۶۳، مطبوعہ سعودیہ)

تجربہ ہے کہ اجراءِ حدود کے اِن صحت منداغراض کو معمولی یا خفیہ سزا دے کر حاصل نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اس صورت میں یا تو سزا کے نام کی تبدیلی کرنی پڑے گی یا سزا کی کوئی نئی تعبیر، نئے معنی ومصداق وضع کرنے پڑیں گے، آج دنیا کے بیشتر ممالک میں سزا اپنے حقیقی معنوں میں سزا باقی نہیں رہی بلکہ حد یہ کہ بیشتر مغربی ممالک میں بہت سے لائقِ سزا جرائم، فہرستِ جرائم ہی سے خارج کردیئے گئے ہیں، اس کے ردِعمل کے طور پر آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ انسانیت نام کی چیز معاشرے سے رخصت ہورہی ہے، بدامنی کی لعنت انسانی معاشرے

پر ایسا سوار ہے کہ آدمی گھر کی چہار دیواری میں بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے، قانون وعدلیہ میں ڈھیل پیدا ہو جانے کی بناء پر دنیا میں ایسے ایسے جرائم رونما ہونے لگے ہیں کہ جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، شاہراہِ عام سے چلتی عورت کو اُٹھا لیا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تجارت کا جاہلی دور پھر لوٹ آیا ہے، چنانچہ کئی ممالک میں بچوں اور عورتوں کی فروختگی کا منظّم جال پھیلا ہوا ہے، عالمی پیمانے پر کئی ملین لڑکے سالانہ اغوا کئے جاتے ہیں اور ان کی آزادانہ خرید وفروخت ہوتی ہے۔

۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء میں فرانس ایک عجیب دہشت کی لپیٹ میں آ گیا تھا، دس سال سے کم عمر بچیوں کو عام مقامات سے اُٹھا لیا جا رہا تھا اور پھر وحشیانہ طور پر ان کو قتل کر دیا جا رہا تھا، تہذیب یافتہ ممالک برطانیہ اور امریکہ میں جرائم کا تناسب مزید قابلِ دید ہے، قتل، چوری، اغوا کاری وغیرہ جرائم کا جو فیصد ۱۹۵۰، ۱۹۶۴ء کے درمیان امریکی ممالک میں پایا جاتا تھا، آج اس کا تناسب دسیوں گنہ بڑھ چکا ہے۔

گذشتہ سالوں کے مقابلے برطانیہ میں ۱۹۸۷ء میں دست درازی اور ڈاکہ زنی کے جرائم ۱۲ / فیصد بڑھ چکے تھے اور جرائم کی تعداد ۴۵ / فیصد تک پہنچ چکی تھی، جنسی بے راہ روی کے باعث دنیا بھر میں کئی ملین افراد ایڈس اور دیگر موذی امراض سے متاثر ہیں، منشیات کے استعمال پر ہونے والی اموات کی تفصیل الگ ہے، عالمی تنظیم صحت کے بموجب ۱۹۸۵ء میں دنیا بھر میں ۳۲ / ملین لوگ منشیات کے عادی تھے (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷ / ۵۲۹۰) روزنامہ منصف میں ۳۱ / مئی ۲۰۰۵ء کو یہ رپورٹ شائع کی گئی تھی کہ صرف تمباکو کے استعمال سے دنیا بھر میں سالانہ ۵۰ / لاکھ اموات ہوتی ہیں۔

جنوبی افریقہ میں صرف گذشتہ سال ۲۰۰۶ء میں انیس ہزار لوگوں کا قتل ہوا، اقامتی مراکز اور رہنے کی جگہوں میں ڈاکہ زنی کا تناسب تشویشناک حد تک ۶ / فیصد سے ۲۵ / فیصد ہو گیا ہے جب کہ تجارتی مراکز میں یہ تناسب بڑھ کر ۵۲ / فیصد یعنی قریب دگنا ہو چکا ہے، حزبِ مخالف نے اس ابتر اور سنگین صورتحال پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ جنوبی افریقہ میں جرائم آؤٹ آف کنٹرول یعنی بے قابو ہو چکے ہیں (ٹائمس آف انڈیا: مضمون نگار، ڈیوڈ بیرس فورڈ)

امریکہ جو خود کو امن کا علمبردار اور عالمی سلامتی کا ٹھیکے دار سمجھتا ہے خود اس کی عوام کا ۲۰۱۲ ء کا جرائم نامہ ملاحظہ ہو:

پر تشدد جرائم	12,14,462
قتل وخون ریزی	14,827
جبری عصمت ریزی	84,376
ڈکیتی	3,54,520
جارحانہ حملے	7,60,739
جائداد واملاک کے جرائم	89,75,438
نقب زنی	21,03,787
عام سرقے کی وارداتیں	61,50,598
گاڑیوں کا سرقہ	7,21,053

ہمارے ملک ہندوستان میں ۲۰۰۲ء میں جملہ جرائم سترہ لاکھ ساٹھ ہزار اور ۲۰۰۷ء-۲۰۰۸ء میں پچاس لاکھ جرائم ہوئے جو قتل عصمت ریزی وغیرہ پر مشتمل تھے، ۲۰۰۷ء-۲۰۰۸ء میں قتل کے جرائم میں تو ہمارے ملک نے امریکہ وپاکستان کو بھی پیچھے کردیا تھا، ہمارے اعداد وشمار 32,719 ہیں جبکہ امریکہ کے 16,692 اور پڑوسی ملک کے 9,631 ہیں ،۲۰۱۲ء میں ہمارے ملک میں 25000 عصمت ریزی کے جرائم رپورٹ ہوئے، ہر 22 منٹ پر ایک واردات رونما ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف وہ اسلامی ممالک کہ جہاں باقاعدہ حدود وقصاص کا نظام نافذ ہے، وہاں مغربی ممالک کے مقابلے جرائم کا تناسب صفر کے درجہ میں ہے، ایک دور تھا کہ سعودی عرب میں بدنظمی اور لوٹ مار کا دور دورہ تھا، حجاج کے قافلوں کو سر پر کفن باندھ کر سفر کرنا پڑتا تھا، راستے بالکل غیر محفوظ تھے، زادِ سفر کب لوٹ لیا جائے اس کی خبر نہیں ہوتی تھی، مگر جب سے وہاں باقاعدہ حدود وقصاص کے نظام کو نافذ کیا گیا ہے، سعودی عرب امن عامّہ اور حقوقِ

انسانی کی حفاظت کے حوالے سے پوری دنیا کے لیے ضرب المثل بن گیا اور حیرت انگیز طور پر وہاں، شرحِ جرائم میں غیر معمولی کمی واقع ہوگئی، کہا جاتا ہے کہ گذشتہ ربع صدی میں صرف ۱۶ر ہاتھ کاٹے گئے ہیں، یعنی پوری مملکت میں اتنے طویل عرصے کے دوران صرف سولہ چوری کے واقعات ریکارڈ کے گئے، سوڈان میں بھی جس وقت حدود وقصاص کا نظام رائج تھا، امن وخوشی قابل رشک تھی، ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب میں مکمل جرائم کی تعداد 84,599 تھی جبکہ اسی سال امریکہ میں 11.88 ملین یعنی ایک سو چالیس گنا زائد تھی، ۲۰۰۲ء میں امریکہ میں نقب زنی کی وارداتیں سعودی عرب سے سات ہزار ایک سو چوالیس گنا زائد ہوئیں ،۲۰۰۷ء میں سعودی عرب میں قتل کے مقدمات 265 اور امریکہ میں 12,996 تھے۔ (Crime in the Uunited States 2012 wikipedia-Nation Master.com)

خلاصہ یہ کہ شرحِ جرائم میں، اسلامی ممالک اور مغربی یا غیر اسلامی ممالک میں ہونے والے جرائم کے درمیان جو بے جوڑ تناسب نظر آرہا ہے اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ غیر اسلامی نظاموں میں، مجرموں کی رعایت اس قدر ملحوظ رکھی گئی ہے کہ سزا کا مقصد اور اس کے معنی ومصداق فوت ہوگئے ہیں، نہ سزا میں یہ تاثیر رہ گئی کہ وہ جرم کا انسداد کرسکے اور نہ جرم کرنے والے کو اس کا خوف رہا کہ اس کو کوئی واقعی سزا ملے گی، اس کے برعکس، اسلامی نظام میں مجرم کے ساتھ بس اسی قدر رعایت برتی گئی ہے کہ سزا کا مقصد فوت نہ ہونے پائے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ حدود اپنے تمامتر قساوت وسنگدلی کے بے جا طعنوں کے، جرائم کے انسداد میں اس قدر مؤثر اور یکتا ہے کہ دنیا کے دستور میں اب تک اس کی نظیر نہیں۔

خدائی نظام اور انسانی خودساختہ نظام کے مابین سابق میں بیان کردہ نظریاتی اختلاف کا ثمرہ دنیائے عمل میں یوں ظاہر ہوا کہ انسانی قوانین تو مجرموں کے لیے ڈھال بن گئے اور خدائی قوانین ستم زدوں کے مسیحا بن گئے، جن ممالک میں انسانی خودساختہ قوانین کی حکمرانی ہے وہاں جرائم اور جرائم پیشہ لوگوں کی روز افزوں ترقی تو ہو رہی ہے مگر قتل اعضاء بریدی اموال واملاک کی ضبطگی وغیرہ جو اسلامی نقطۂ نظر سے دراصل فردِ جرم کی قرارداد یں اور جرم کا

حصہ ہیں، وہ عرصے سے اِن ملکوں کے ستم زدوں اور جرائم زدہ لوگوں کا مقدر بن چکے ہیں، اگر اس قلب وعکس کا نام ہی قساوت وسنگدلی ہے تو یہ اس خونین دستور سے بدرجہا بہتر ہے جس کے ایک ایک حرف سے مظلوموں کا لہو چھلکتا ہے، اگر جان بچانے اور پورے جسم کو محفوظ رکھنے کی خاطر سڑتے عضو کو تلف کر دینا، سنگدلی کہلاتی ہے تو یہ سنگدلی اس بیوقوفی سے اور یہ قساوت اس حماقت سے بدرجہا بہتر ہے کہ جس کی چکر میں آ کر سڑتے حصے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے اور جان کا جوکھم مول لیا جائے۔

بدعت ایک سنگین گناہ

اسلام ایک دین حق ہے،جس کی بنیاد وحی پر قائم ہے کتاب وسنت اس کا دستور ہے اس کی تعلیمات انسانی طبائع ومصالح سے نہایت ہم آہنگ ہیں، اس کی شریعت بڑی ہی سہل ہے، ہر ملک وملت، ہرزمانہ ومقام میں اس کی ہدایات یکساں طور پر قابل عمل ہیں، ہر حکم ایسا کہ جس کی تعمیل میں نہ ہی عامل کو کوئی طاقت سے زیادہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ ہی حکم کی بجاآوری کی وجہ سے معاشرے کو زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔

ہر عمل کی اپنی حیثیت ہر فعل کا مناسب مقام درجہ مقرر ہے، افراط وتفریط غلو وتقصیر سے اس کا دامن بالکل پاک ہے، ایک ابدی دین اور ایک آسمانی شریعت کی یہی خصوصیات ہوسکتی ہیں، اس کے برخلاف، وہ مذاہب جن کا سرِ رشتہ بجائے خدا کے انسانوں سے جُڑا ہوتا ہے، جن کے قوانین کی قانون سازی بجائے وحی کے عقل سے کی جاتی ہے، جن کی شریعت میں اعمال کے حسن وقبح (اچھے بُرے) کا فیصلہ انسانی اذواق کے سپرد ہوتا ہے، ایسے مذاہب ونظریات سراپا بے اعتدالیوں کا مظہر ہوتے ہیں۔

ان ادیان میں خدا پرستی کے مقابلے نفس پرستی کا عنصر غالب رہتا ہے،حق پرستی کی آڑ میں باطل کی پرستش جاری رہتی ہے، پھر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کی من گھڑت شریعت خود ان کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے، جسے وہ بڑی بے تابی سے نکال پھینک دیتے ہیں اور قیدِ مذہب سے آزاد ہوکر علانیہ بے راہ روی اختیار کر لیتے ہیں۔

نصرانیت کی تاریخ اسی کش مکش اور نفس پرستی کے بدترین عواقب ونتائج سے دوچار ہوئی ہے، خدائے تعالٰی فرماتے ہیں: اور انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کرلیا ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن انہوں نے حق تعالٰی کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا پھر اس کو جیسا نباہنا چاہیے تھا نہ نباہا پھر ہم نے ان لوگوں کو جو، ان میں ایمان دار تھے ان کا بدلہ دیا اور بہت ان میں نافرمان ہیں۔(سورہ حدید:۲۷)

غلو اور دین میں مبالغۂ آرائی کے مشترک وصف کے اعتبار سے اہل بدعات کا قریبی رشتہ، نصاریٰ سے جاملتا ہے، درحقیقت بدعت بھی ایک ایسا روگ ہے جس کا سرچشمۂ ہدایت کتاب وسنت کے علوم نہیں ہوتے بلکہ بدعات تمام تر انسانی تجاویز کے تابع ہوتی ہیں۔ بدعات کی وضع وبنیاد نہ تو خدا کے اس ابدی قانون پر ہوتی ہے جو باطل کی ہر قسم کی رخنہ اندازیوں سے محفوظ کر دیا گیا ہے اور نہ ہی اس ذات گرامی کے اعمال وہدایات کی روشنی میں ہوتی ہے جو خطاؤں سے مکمل معصوم ہے بلکہ بدعات کی پیدائش ونشونما چند ایسے اسباب کے زیر اثر ہوتی ہے جن کو دلائل کا عنوان دینا انتہائی مضحکہ خیز اور حقائق کے ساتھ کھلواڑ ہے۔

حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ نے بدعت کے ایجاد کے چار اسباب بتلائے ہیں:۔

(۱) جہالت وبدفہمی۔

(۲) شیطانی فریب یعنی شیطانی تصرف اور اس کے اثر سے بری چیزوں اور طریقوں کو بھلا سمجھنا۔

(۳) حب جاہ اور شہرت پسندی کا مرض۔

(۴) غیر اقوام کی تقلید اور تمدن ومعاشرت میں ان سے متاثر ہونا (اختلاف امت اور صراط مستقیم:۹۱-۹۳)

ظاہر ہے ایسے ناپائدار ستونوں پر بدعات کی عمارت کب کھڑی رہ سکتی ہے، بدعات کا حامی در پردہ شریعت کے ناقص ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے عمل اور اپنے جاری کردہ طریقوں سے گویا شریعت کی تکمیل کرنے والا اپنے آپ کو قرار دیتا ہے، اس اعتبار سے بدعت، دینِ حق کے متوازی ایک مستقل مذہب اور بدعتی گویا نبی کا حریف ہوتا ہے۔

بدعت کی تعریف:

بدعت کے لغوی معنیٰ ہر وہ چیز جو کسی سابق نمونہ کے بغیر کی جائے۔(فتح الملہم ۳۱۹/۲)

حضرت عمرؓ سے ایک امام کی اقتدا میں باجماعت نماز تراویح کے باقاعدہ عمل پر بدعت کا اطلاق، بدعت لغوی ہی کے قبیل سے ہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ کی جانب سے جاری کردہ تراویح کے خصوصی اہتمام کی شکل کسی سابقہ نمونہ ومثال کے بغیر تھی۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ رسول ﷺ نے اپنے زمانہ میں تراویح کا خصوصی اہتمام اس اندیشہ کے پیشِ نظر ترک فرمادیا تھا کہ کہیں صحابہ کے ذوق وشوق کی بنا پر یہ نماز فرض نہ کردی جائے پھر بعد والوں کے لئے مشقت کا باعث نہ بن جائے، اس لئے کہ آپ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں جن دو تین راتوں میں با جماعت تراویح کی نماز ادا فرمائی تھی، اس میں صحابہؓ بڑی ہی رغبت کے ساتھ شریک ہو رہے تھے، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد، وحی کے موقوف ہونے کی وجہ سے فرضیتِ تراویح کا اندیشہ چوں کہ ختم ہو چکا تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے منشأ نبوی (فرض ہوئے بغیر تراویح کا اہتمام کرنا) کی تکمیل کے مقصد سے تراویح کا با قاعدہ (ایک امام کی اقتداء میں مکمل ماہ تراویح پڑھنے کا) رواج ڈالا تھا، پھر ایک موقع پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں فرمایا: کیا خوب بدعت ہے! کنز العمال کی روایت میں ہے کہ آپؓ نے فرمایا: اگر اسے (باعتبار لغت) بدعت کہا جا سکتا ہے تو یہ خوب بدعت ہے۔ گویا حضرت عمرؓ نے از راہِ تفنن ونکتہ سنجی اس عمل پر بدعت کا اطلاق فرمایا تھا اور یہ حضرت عمرؓ ہی کو زیب دیتا ہے، ہمارے لئے نہ تو اس پر لغوی اعتبار سے بدعت کا اطلاق درست ہے نہ شرعی اعتبار سے، ہمارے حق میں تو بحکمِ حدیث، سنتِ رسول اللہ اور سنتِ خلفاء راشدین دونوں ہی سرمۂ چشم ہیں (فتح الملہم ۲/۳۱۹)

بدعت کے اصطلاحی معنٰی وہ خود تراشیدہ طریقہ جو شرعی طریقہ کے بالمقابل دین میں اس مقصد سے جاری کیا گیا ہو کہ ادائیگی عبادت میں مبالغہ آرائی کی جائے۔ (الاعتصام للشاطبی ۱/۳۷ بحوالہ تکملہ فتح الملہم ۲/۵۹۵) حکیم الامت حضرت تھانویؒ بدعت کی شناخت وپہچان کا ایک نہایت جامع کلیہ بیان فرماتے ہیں؛ نئے ایجاد کردہ اعمال وطریقوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

(۱) وہ اعمال یا طریقے جو خود بھی نئے ہوں اور جن کا سبب بھی نیا ہو یعنی زمانہ رسالت میں اس سبب کا وجود نہ رہا ہو لیکن وہ طریقے ایسے ہوں کہ ان کے اختیار کرنے پر دین کا کوئی اہم حکم موقوف ہو اور اس حکم شرعی کی تعمیل بغیر ان طریقوں کو اختیار کئے پوری نہ ہوتی ہو تو ایسے اعمال وطریقے بظاہر بدعت ہیں لیکن حقیقت میں شریعت کے حکم کے تابع اور اللہ کے نزدیک

مقبول ہیں، جیسے دین سے عمومی بے پرواہی اور خدااور رسول کے احکام کی تابعداری سے عمومی غفلت دور کرنے کے سبب سے کتبِ دینیہ کی تصنیف وتدوین اور مدارس خانقاہوں کا قیام وغیرہ۔

(۲) وہ اعمال یا طریقے جوخود نئے ہوں لیکن ان کا سبب قدیم ہو یعنی خیر القرون (صحابہ وتابعین وغیرہ کے زمانہ) میں اس سبب کا وجود ہو جیسے میلا دالنبی ﷺ کی خوشی میں مجالس میلا دکا انعقاد اور جشن وجلوس کے عجیب وغریب مظاہرے، یہ سارے طریقے ایسے ہیں جوخود تو نئے ہیں لیکن ان کا جو سبب ہے یعنی پیدائش نبی ﷺ کے دن کا آنا، یہ کوئی نیا سبب نہیں ہے خود رسالت مآب ﷺ کی زندگی میں ترسٹھ مرتبہ صحابہ وتابعین وتبع تابعین کے زمانہ میں سینکڑوں دفعہ یہ سبب آیا بھی گیا بھی لیکن کسی نے اس طرح کے کرتب ومظاہرے نہیں کئے، حالاں کہ حبِّ نبوی اور اتباعِ شریعت کے معاملہ میں وہ ہم سے ہزاروں گنا بڑھے ہوئے تھے، پس ایسے سارے طریقے بدعت ومردود کہلائیں گے اور اس ارشادنبوی ﷺ کا مصداق بنیں گے: جس کسی نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردود ہوگی۔ (بخاری ومسلم)

حضرت تھانویؒ مزید فرماتے ہیں: دوقسموں میں ایک اور فرق عجیب ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام تصرف نہیں کرتے اور دوسری قسم کے تجویز کرنے والے عوام کالانعام ہوتے ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں، چنانچہ مولدشریف کی مجلس کوایجادایک بادشاہ نے کیا ہے کہ اس کا شمار عوام ہی میں ہے اور عوام ہی اب تک اس میں شرکت بھی کررہے ہیں۔ (اشرف الجواب۔ ملخصا ۹۲-۹۳)

علامہ ابوشامہ المتوفی ٦٦٥ھ فرماتے ہیں: عبادات کے لئے اپنی طرف سے اوقات وایام کی تعیین کرنا اوران کوفضیلت والاقرار دینا یہ بھی بدعت ہے، کیوں کہ تخصیص وتعیین مکلّف کا منصب نہیں، صاحب شریعت کا منصب ہے، امام شافعیؒ اس بنیاد پر ماہ رجب کے روزوں کومکروہ سمجھتے تھے کہ خواہ مخواہ عوام اسے واجب یا مستحب سمجھنے لگیں گے، شیخ خراسان امام عبداللہ انصاریؒ رجب میں روزہ نہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ رجب کے روزوں کی فضیلت میں اللہ کے رسول ﷺ سے کوئی حدیث صحیح سند سے ثابت نہیں بلکہ صحابہ کرام کی

ایک جماعت سے اس ماہ کے روزوں کا مکروہ ہونا ثابت ہے، حضرت عمرؓ ایسے لوگوں کو - جو رجب کا مکمل مہینہ روزہ رکھنے کو ضروری خیال کرتے تھے -کوڑے سے مارتے تھے اور ان کو کھانے پر مجبور کرتے تھے۔(الباعث علی انکار البدع والحوادث ۱/۵۲)

بدعت حسنہ وسیئہ کی تحقیق:

یہاں یہ وضاحت بھی پیش نظر رہے کہ علماء امت کے اس بارے میں دو نقطہ نظر ہیں کہ بدعت آیا حسنہ (بھلی) بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ علماء کے ایک بڑے گروہ کا کہنا ہے کہ بدعات کی حسنہ اور سیئہ (بھلی اور بری) کی جانب تقسیم ہوسکتی ہے، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: اگر بدعت شریعت کی کسی پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے تو وہ بدعت حسنہ ہوگی اور اگر وہ شریعت کی کسی غیر پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے تو وہ بدعت قبیحہ ہوگی۔(فتح الباری ۴/۲۱۹) پس اس گروہ کے یہاں، حضرت تھانویؒ کی عبارت کے ذیل میں مذکورہ قسمِ اول بدعت حسنہ کے قبیل سے ہوگی اور قسم ثانی، بدعت سیئہ کے قبیل سے۔

دوسرے گروہ کے یہاں، بدعت کی سرے سے حسنہ وسیئہ کی طرف تقسیم نہیں ہوتی، بدعت سرتا پا عنوان ہی ہے گمراہی کا، اس میں خوبی وحسن کا کیا سوال ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں: ہر بدعت گمراہی ہے اگر چہ لوگ اس کو حسن سمجھیں۔(السنۃ للمروزی :۸۲) امام مالک فرماتے ہیں: جو شخص اسلام میں کسی بدعت کی ایجاد کرے پھر اسے حسنہ سمجھے تو -نعوذ باللہ- وہ یہ دعوی کررہا ہے کہ محمد ﷺ نے رسالت کی ذمہ داریوں میں خیانت کی۔ (الاعتصام للشاطبی ۱/۶۵) امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا بھی یہی موقف ہے، فرماتے ہیں:

کہنے والوں نے کہا کہ بدعت دو قسم ہے، حسنہ اور سیئہ .... فقیر ان بدعتوں میں سے کسی بدعت کے اندر حسن ونورانیت کا مشاہدہ نہیں کرتا اور ظلمت وکدورت کے سوا کسی شئ کا احساس نہیں ہوتا .... حضور سید البشر علیہ وآلہ الصلوات والتسلیمات فرماتے ہیں: جس نے ہمارے اس دین میں وہ چیز نکالی جو اس میں نہ ہو تو وہ شئ مردود ہے۔ جو چیز مردود ہو اس میں حسن کہاں سے آسکتا ہے۔ نیز آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: نئے نئے امور سے بچنا، پس بیشک ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی وضلالت ہے۔ تو

جب دین میں ہرنئی چیز بدعت ہے اور بدعت ضلالت وگمراہی ہے تو بدعت میں اچھائی ہونے کا کیا معنی؟ (مکتوب:۱۸۶)

پس یہ گروہ باعظمت، قسمِ اول جیسے امور کو بدعت حسنہ کے بجائے سنت کے تحت داخل کرتا ہے۔(حاشیہ مکتوب مذکوراز مولانا سعید احمد صاحب نقشبندی)

لیکن ظاہر ہے دونوں گروہوں کا یہ اختلاف محض لفظی ہے اور فرق صرف اصطلاح کا ہے ورنہ تو دونوں ہی جماعتیں قسم اول جیسے امور کو مقبول اور قسم ثانی جیسے اعمال کو مردود قرار دینے پر متفق ہیں۔

موجودہ زمانہ میں بدعات پرست دنیا دار علماء چوں کہ بدعت حسنہ کی اصطلاح سے مغالطہ دے کر عوام الناس کو طرح طرح کی بدعات سیئہ میں ملوث کرر ہے ہیں، اس لئے ایسے ماحول میں بدعت کے اس چور دروازے کو بالکلیہ بند کرنے اور بدعت حسنہ کی اصطلاح کو بالکلیہ ترک کرنے کی ضرورت ہے، الحمدللہ اتنے گئے گذرے دور میں بھی عوام الناس میں اتنا شعور وایمان بلا شبہ باقی ہے کہ وہ بدعات سیئہ کو سنت کے عنوان سے کبھی اور کسی قیمت قبول نہیں کرتے۔

حضرت مولانا منظور صاحب نعمانیؒ کے بقول: حضرت مجدد الف ثانیؒ نے دراصل بدعت کے اسی چور دروازے کو بند کرنے کی غرض سے یکلخت بدعت کی تقسیم سے انکار فرمادیا تھا۔

مولانا نعمانیؒ لکھتے ہیں: بدعتِ حسنہ کا نظریہ بھی جس کے پردہ میں اس عہد کے علماء سو(بُرے علماء) نے اپنی خواہشات نفس کا جز و بنا رکھا، حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی نظر میں سخت خطرناک تھا، اس لئے آپؒ نے اس نظریئے ہی کے خلاف جنگ کی اور بلاخوفِ لومۃ لائم (کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ کئے بغیر) بالکل مجددانہ انداز میں کسی بدعت کے حسنہ ہونے سے انکار فرمایا۔(تذکرہ مجدد الف ثانیؒ ص:۱۵۷)

بدعت اور بدعتی: صاحب شریعت کی نظر میں

حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں: آنحضرت ﷺ جمعہ کے خطبہ میں جب کہ ہزاروں کا مجمع سامنے ہوتا تھا، پُر زور اور بلند آواز سے یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ، اما بعد!

بہترین بیان: اللہ تعالیٰ کی کتاب اور بہترین نمونہ اور سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے اور وہ کام بُرے ہیں جو نئے نئے گھڑے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔(مسلم: حدیث: ۱۴۳۵)

امام نسائیؒ کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔(نسائی حدیث نمبر: ۱۵۶۰) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ منورہ، مقام عیر سے لے کر مقامِ ثور تک حرم ہے، سو جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو نہ تو اس کی فرضی عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفلی۔(بخاری حدیث نمبر: ۶۷۵۵) حضرت عبد اللہ بن عباسؓ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت کو ترک نہ کر دے۔(ابن ماجہ حدیث نمبر: ۴۹)

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اللہ تعالیٰ کسی بدعتی کا نہ روزہ قبول کرتا ہے اور نہ نماز نہ صدقہ قبول کرتا ہے اور نہ حج نہ عمرہ اور نہ جہاد اور نہ کوئی فرض عبادت قبول کرتا ہے اور نہ نفلی، بدعتی اسلام سے ایسے خارج ہو جاتا ہے جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال نکل جاتا ہے۔(ابن ماجہ حدیث نمبر: ۴۸)

حضرت ابراہیم بن میسرہؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی بدعتی کی تعظیم وتوقیر کی، اس نے اسلام کو گرانے میں ان کی مدد اور اعانت کی۔(مشکوٰۃ حدیث نمبر: ۱۸۹)

بدعت اور اہل بدعت سے صحابہ کی نفرت:

امام نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کے سامنے ایک شخص کو چھینک آئی اس نے کہا **الحمد لله والسلام علی رسول الله** ، یہ زائد کلمہ **والسلام علی رسول الله** اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے مگر اس موقع پر چوں کہ حضور ﷺ نے کہنے کی تعلیم نہیں دی، اس لئے اس اضافے کو ناپسند کرتے ہوئے حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ آں حضرت ﷺ نے اس طرح تعلیم نہیں فرمائی اس موقع پر آپ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اس طرح

کہیں الحمد الله علی کل حال۔(ترمذی حدیث نمبر:۲۶۶۲)

چاشت کی نماز حدیث سے ثابت ہے(مگر گھر میں یا مسجد میں تنہا تنہا)اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جب دیکھا کہ کچھ لوگ مسجد میں جمع ہوکر اور مظاہرہ کر کے پڑھتے ہیں تو آپؓ نے اسے ناپسند فرمایا اور بدعت قرار دیا۔(بخاری شریف حدیث نمبر:۱۶۵۲) نماز صبح میں لوگ جمع ہوکر خاص طریقہ سے سومرتبہ لا الٰہ الا الله سومرتبہ سبحان الله پڑھتے تھے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس کی خبر دی تو ابن مسعودؓ وہاں تشریف لے گئے اور ان لوگوں سے پوچھا کہ تم یہ کیا کررہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا اے ابوعبدالرحمٰن! ہم ان سنگریزوں سے تکبیر، تہلیل اور تسبیح شمار کرتے ہیں، آپؓ نے فرمایا بجائے اس کے تم اپنے گناہ شمار کرو پھر فرمایا: اے امت محمد ﷺ! تم پر افسوس تمہاری ہلاکت کس قدر جلدی آ گئی، ابھی یہ اصحابِ نبی ﷺ تمہارے درمیان بکثرت موجود ہیں اور تمہارے نبی ﷺ کے کپڑے بوسیدہ نہیں ہوئے اور ان کے برتن نہیں ٹوٹے (اور تم ابھی سے بدعتوں میں مشغول ہوئے) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یا تو تم ایک ایسے دین پر ہو جو حضرت محمد ﷺ کے دین سے (نعوذ باللہ) زیادہ راست اور صحیح ہے یا تو تم گمراہی کے دروازے پر پہنچ گئے جو عنقریب کھلنے والا ہے، ان لوگوں نے جواب دیا، اے ابوعبدالرحمٰن! قسم خدا کی ہم اس عمل سے نیکی ہی کا ارادہ رکھتے ہیں، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: بہت سے نیکی کا ارادہ کرنے والے ایسے ہیں کہ انہیں نیکی حاصل نہیں ہوتی،(سنن دارمی حدیث نمبر:۲۱۰) امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے عید کے دن عید گاہ میں نمازِ عید سے پہلے ایک شخص کو نفل نماز پڑھنے سے روک دیا، اس نے کہا اے امیر المؤمنین مجھے امید ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر عذاب نہ دے گا، حضرت علیؓ نے فرمایا: مجھے یقین ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو کام نہیں کیا یا کرنے کی ترغیب نہیں دی ہے تو وہ کام عبث ہوگا اور عبث کام، بے کار و بے فائدہ ہے، پس ڈر ہے کہ حضور ﷺ کے طریقہ سے مخالف ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذاب دے۔(فتاوی رحیمیہ ۱۳۵/۲) حضرات صحابہ کرامؓ کی بدعت سے بیزاری کے یہ چند نمونے ہیں اگر صحابہ کرامؓ اور اسلافِ امت کی بدعت سے بیزاری کے واقعات کو جمع کیا جائے تو ایک پورا دفتر تیار ہوسکتا ہے!

بدعات کے مفاسد ونقصانات:

یوں تو بدعات کے دنیوی واخروی بے شمار مفاسد ہیں مگر عملی دنیا میں بدعات کے جو وسیع تر نقصانات ہیں ان کو تین خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے:

الف: سنت سے دوری وتہی دستی

جو شخص بدعات کا خوگر ہوتا ہے وہ رفتہ رفتہ سنت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور جب اجتماعی طور پر بدعات کو اختیار کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کے تحت اس معاشرے سے سنتوں کو اٹھا لیا جاتا ہے اور معاشرہ سنت کے انوار وبرکات سے محروم اور بدعات کی نحوست کا شکار ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: کوئی قوم بدعت ایجاد نہیں کرے گی مگر اسی کی مقدار میں سنت ان سے اٹھا لی جائے گی، تو سنت کو مضبوطی سے پکڑنا، بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے، (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۶۳۵۶) حضرت حسان تابعیؒ فرماتے ہیں: کوئی قوم بدعت نہیں نکالے گی مگر اللہ تعالیٰ اتنی ہی مقدار میں سنت ان سے اٹھا لے گا اور پھر قیامت تک ان کو وہ سنت واپس نہ دے گا۔ (دارمی حدیث نمبر: ۹۹)

ب: توبہ کی توفیق سے محرومی۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے، (بیہقی حدیث نمبر: ۹۰۱۰) (مجمع الزوائد ۱۰/۱۸۹) حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ بدعت ابلیس کو تمام گناہوں سے زیادہ محبوب ہے اس لئے کہ گناہوں سے تو توبہ ہو سکتی ہے اور بدعت سے توبہ نہیں کی جاتی اور اس کا سبب یہ ہے کہ گنہگار تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہے اس لئے اس سے توبہ واستغفار کی توقع ہے جب کہ بدعتی اس خوش اعتقادی میں رہتا ہے کہ وہ طاعت وعبادت میں لگا ہوا ہے پس نہ ہی وہ توبہ کرتا ہے نہ استغفار اور نہ ہی اس کا اس کو دھیان ہوتا ہے۔

یہ مضمون خود ابلیس سے منقول ہے: اس نے کہا: میں نے بنو آدم کی کمر معاصی اور گناہوں سے توڑ دی تو انہوں نے میری کمر توبہ واستغفار سے توڑ دی تو میں نے ان کے لئے

ایسے گناہ نکالے ہیں کہ جن سے وہ نہ استغفار کرتے ہیں اور نہ توبہ (اور وہ بدعتیں ہیں عبادت کی صورت میں) (بیہقی شعب الایمان: حدیث نمبر:۹۰۰۹، الجواب الکافی ۲/۱۷۴)

ج: اصل فرائض سے غفلت:

بدعات کا جو آدمی دلدادہ ہوتا ہے، اس کے سارے جذبات، اس کی ساری اچھی صلاحیتیں، اس کے جسمانی قویٰ، بدعات کے مشغلوں میں صرف ہوجاتے ہیں، جس کی بنا پر اول تو وہ بدعات سے عباداتِ اصلیہ کی طرف آتا ہی کم ہے پھر اگر کسی طریقہ سے عبادات کو انجام دے ہی لے تو نہایت، بے دلی، مردہ مزاجی اور سستی کے ساتھ انجام دیتا ہے، ظاہر ہے خشوع وخضوع سے عاری ایسی عبادتیں، بارگاہِ خداوندی میں کہاں شرف قبول پاسکتی ہے؟

علامہ ابن قیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

جو شخص نامشروع، غیر شرعی اعمال میں اپنی قوتیں خرچ کرڈالتا ہے تو شرعی عمل کے انجام دہی کے موقع پر اس کی قوتیں نہایت ضعف ولاغری کا شکار رہتی ہیں جیسے کوئی اپنی طاقت شیطانی سماع میں خرچ کردے تو (اول تو ایسا آدمی شب بیداری کا حوصلہ وہمت ہی نہیں رکھتا لیکن اگر کسی وجہ سے شب بیداری کرہی لے تو) بڑی کاہلی اور بے کیفی سے شب بیداری کا ڈھونگ رچاتا ہے، (اعلام الموقعین ۴/۱۹۳)

اللہ تعالیٰ بدعات ومنکرات کے پرفریب طور طریق سے ہماری حفاظت فرمائے اور شب وروز سنتوں کے ماحول میں گذر بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں: ہر فضیلت آنحضرت ﷺ کی سنت کی پیروی سے اور رہر کمال آپ ﷺ کی شریعت کے اتباع سے وابستہ ہے، مثلاً سنت نبوی کے اتباع کے طور پر دوپہر کا سونا، کروڑوں رات جاگنے سے بہتر اور افضل ہے جب کہ یہ شب بیداری شریعت کی پیروی اور طریقۂ نبوی کے بغیر ہو۔ (مکتوب:۱۱۴)

مسلکِ غیر مقلدیت ۔ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں

فرقۂ غیر مقلدیت جو بزعم خود اہل الحدیث کے مقدس وقابلِ عظمت نام کے ساتھ اپنے آپ کوموسوم کرتا ہے، وہ درحقیقت مسلک ومشرب میں اصحابِ ظواہر سے نہایت ہی قریبی مشابہت رکھتا ہے ،تاریخ اسلام میں جوفرقہ اہلِ ظواہر کے نام سے گذرا ہے وہ اجماع وقیاس کی حجیت (اوران کی فرع تقلید) کا قائل نہیں تھا ،جب کہ اہل حدیث کے نام سے جو طبقہ گذرا ہے، وہ باقاعدہ طور پر آثار صحابہ واجماعِ امت کا قائل اوران کا ناقل تھا ،ایسے ہی بوقتِ ضرورت تفقہ واستنباط سے بھی کام لیتا تھا اوراحادیث کیساتھ فوائد وتراجم الحدیث کا بھی استخراج کیا کرتا تھا۔(حجۃ اللہ البالغۃ مع ھامشہ ۱/۴۴۹)

موجودہ دور کے نام نہاد اہلِ حدیث فرقہ کا نشانِ امتیاز بھی انکارِ اجماع وانکارقیاس ہی ہے ،اس لئے ان کی اصل ،تاریخ اسلام کے مقدس ترین قافلۂ اہلِ حدیث کے بجائے اہل ،ظواہر سے ملتی ہے ،البتہ گذشتہ زمانے کے اہلِ ظواہر اورموجودہ دور کے ظاہر پرستون کے درمیان جو چیز وجہِ امتیاز بن سکتی ہے، وہ علمیت وشرافت اور جہالت وخباثت ہے ،زمانہ سابق کے اہلِ ظواہر علم وفضل میں اپنی خاص پہچان رکھتے تھےاوراپنے موقف مین مخلص بھی ہوا کرتے تھے ،اس سلسلہ میں داؤد بن علی ظاہریؒ اورفخرِ اندلس ابن حزم ظاہریؒ کا نام لینا کافی ہے، جب کہ مروّجہ اہلِ ظواہر کی اکثریت جہلِ مرکب میں اپنی خصوصی شان بنائے ہوئے ہے، جس کی بناء پر انکارِاجماع ،انکارِقیاس ،انکارِتقلید کے علاوہ توہینِ اسلاف اور تضلیل مقلدین کے خبیث مظاہر بھی آئے دن ان سے رونما ہوتے رہتے ہیں، گویا عملی طور پرموجودہ دورمیں مسلک غیر مقلدیت کی بنیاد اِن اصولِ خمسہ پر قائم ہے۔

(الف)انکارِاجماع (ب)انکارِقیاس (ج)انکارِتقلید (د)توہینِ اسلاف (ہ)تضلیلِ مقلدین ۔۔ذیل میں ان کا شریعت کی روشنی میں مختصر سا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(الف) انکارِ اجماع: غیر مقلدین کے مطابق دین اسلام کی اصل صرف دو ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور اجماع کوئی چیز نہیں ۔(عرف الجاوی:۳۰) مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسین خان نے بھی ببانگِ دہل حجیتِ اجماع کا انکار کیا ہے ۔(افادۃ الشیوخ:۱۲۱) حالانکہ اجماع کی حجیت ،صراحتاً دو اصولوں (کتاب وسنت) سے ثابت ہے جو فریقِ اخر کے یہاں بھی مسلّم ہے،ارشادِ ربانی ہے: جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی ہو اور اہلِ ایمان کے راستے کے علاوہ دوسرے راستہ کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اس طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں داخل کریں گے(سورۃ النسا:۱۱۵) حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا: اس آیتِ کریمہ میں جہاں رسول کی مخالفت پر گمراہی اور دوزخ میں داخل ہونے کی وعید آئی ہے، وہیں اہل ایمان کی مخالفت پر بھی وعید ہے اور یہ اجماع کے حجت ہونے کی کھلی دلیل ہے،مروی ہے کہ ہارون رشید نے حضرت امام شافعیؒ سے اجماع کی حجیت پر دلیل طلب کی تھی تو امام شافعیؒ نے اس کی خاطر تین دفعہ قرآن پاک کو بنظرِ غائر پڑھا اور آیت مذکورہ بطور دلیل پیش فرمائی (المجموع شرح المہذب ۱/۴۲۔ الابہاج فی شرح المنہاج ۲/۳۵۳:حجیۃ الاجماع) ارشادِ نبوی ہے: میری امت ضلالت وگمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی ۔(ترمذی باب ما جاء فی لزوم الجماعۃ:۲۱۶۷۔ باب السواد الاعظم:۳۹۵۰) جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جس چیز کو مسلمان برا سمجھیں ، وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے (مسند احمد: مسند عبداللہ بن مسعودؓ:۳۶۰۰) ایک موقع سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص جماعت سے بالشت برابر جدا ہوا تو اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے الگ کردی۔(ابوداؤد: باب فی قتل الخوارج:۴۷۵۸) میرے صحابہ میری امت کے نگہداشت ہیں(مسلم: باب بیان ان بقاء النبی امان لاصحابہ وبقاء اصحابہ امان للامۃ:۲۵۳۱) میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتدا کروگے راہ یاب ہو جاؤ گے۔(مشکوۃ باب مناقب الصحابۃ:۶۰۱۸) علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: فقہاء،صوفیاء اور عامۃ المسلمین کے نزدیک بالاتفاق اجماع حجت ہے البتہ اہلِ بدعت مثلاً معتزلہ اور شیعہ وغیرہ اس کے مخالف ہیں (المستدرک علی مجموع الفتاوی: الاصل الثالث الاجماع:۲/۱۱۳)

منکرینِ اجماع غیر مقلدین کو ان تصریحات کی روشنی میں ہوش کے ناخن لینے چاہیے کہ وہ ایمانداروں کی راہ چھوڑ کر کن گم کردہ راہ لوگوں کی روش پر چل رہے ہیں!

(ب) انکارِ قیاس: قیاس ایک لحاظ سے چونکہ اجماع ہی کی ایک فرع ہے کہ اجماع اتفاقِ رائے اور قیاس شخصی رائے سے عبارت ہے، یعنی رائے کا دخل دونوں میں ہے، اس لئے منطقی طور پر منکرینِ اجماع، لامحالہ منکرینِ قیاس بھی ہونگے، چنانچہ قدیم اہلِ ظواہر کی طرح، نومولود فرقہ ظاہریہ بھی قیاس کی حجیت کا منکر ہے، نواب نورالحسن خان تحریر فرماتے ہیں: اجماع کی کوئی حیثیت نہیں تو قیاس مصطلح جسے فقہاء نے چوتھی دلیل قرار دیا ہے، خود ہی اس کی ضرورت پوری ہوگئی اور وہ کچھ نہ رہا، سوائے اس کے کہ دین اسلام اور خیرالانام کی ملتِ حقہ کی دلیلیں دو چیزوں میں منحصر ہیں، کتاب اللہ، سنتِ مطہرہ اور ان دونوں چیزوں کے علاوہ کوئی چیز بھی حجتِ نیّرہ اور برہانِ قاطع نہیں۔ (عرف الجاوی: حوالۂ سابق) حالانکہ حجیتِ قیاس کا ثبوت بھی کتاب اللہ کی کثیر آیات سے ہوتا ہے اور سورہ حشر آیت: ۲ میں تو صاف طور پر فرمایا گیا ہے: اے خردمندو! قیاس وعقل سے بھی کام لو، حضرت تھانویؒ ترجمہ فرماتے ہیں: سو؛ اے دانشمندو! عبرت حاصل کرو۔

بیشمار احادیثِ احکام میں خود آپ ﷺ نے علل واوصافِ مؤثرہ کے استخراج کی رہنمائی فرمائی ہے، حضرت معاذ کو یمن روانہ کرتے وقت آپ ﷺ نے گویا بغرضِ امتحان وہدایت ان سے وہاں پیش آنے والے مسائل سے نمٹنے کا طریق دریافت فرمایا، انہوں نے عرض کیا! یارسول اللہ! پہلے کتاب اللہ کو مقدم رکھوں گا پھر سنتِ رسول اللہ کو پیش نظر رکھوں گا پھر اجتہاد وقیاس سے کام لوں گا، آپ ﷺ نے اس جواب پر فرطِ مسرت سے ان کا سینہ تھپتھپایا اور بارگاہِ خداوندی میں شکر بجا لایا۔ (ترمذی باب ما جاء فی القاضی کیف یقضی :۱۳۲۷) امام مزنیؒ فرماتے ہیں کہ تمام فقہاء آنحضرت ﷺ کے زمانے سے آج تک تمام احکام دینیہ میں قیاس کرتے چلے آئے ہیں اور ان کا اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہے اور باطل کی نظیر باطل ہے (اعلام الموقعین ۱/۱۹۷) خود مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خان ایک طرف تو یوں لکھتے ہیں: قیاس شرعی میں اختلاف ہے، جمہور حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین

،فقہاءؒ، متکلمینؒ اس طرف گئے ہیں کہ قیاس شریعت کے اصول میں سے ایک اصل ہے، احکام شرعیہ میں اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے اور اہل ظاہر نے قیاس کی حجیت سے انکار کیا ہے (افادۃ الشیوخ :۲۲) دوسری طرف خود ان کے حواریین وہم جماعت، جمہورِ امت سے کٹ کر اہلِ ظاہر کے شانہ بشانہ چلتے ہیں (الکلام المفید :۱۱۲) نواب وحید الزماں لکھتے ہیں: حق بات یہ ہے کہ اجماعِ ظنی اور قیاس دونوں حجت ملزمہ نہیں (ہدیۃ المھتد ی ۱/ ۸۲) انکارِ قیاسِ شرعی کے ذریعہ مروّجہ اہلِ ظاہر،تفرداور جمہورِ امت سے انحراف کی جو راہ اختیار کئے ہوئے ہیں، انہیں ان مندرجہ ذیل احادیث پر نگاہ ڈال کر اپنے انجام کے تعلق سے کچھ سنجیدہ طریقہ سے غور وخوض کر لینی چاہیے، ارشادِ نبوی ہے: جمعیتِ عظمیٰ کی پیروی کرو اس لئے کے جو جمعیت سے خارج اور علیٰحدہ ہوا، وہ اسی علیٰحدگی کی شان سے جہنم رسید ہوگا۔(مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ :۱۷۴) جیسے بکریوں کا ایک بھیڑیا ہوتا ہے، جو ریوڑ سے دور بیگانہ، علیٰحدہ بکری کو اچک لیتا ہے، ایسے ہی انسانوں کا بھیڑیا شیطان ہے (جو انسان کو لقمہ بنانے کی تاک میں رہتا ہے) پس تم انتشار و علیٰحدگی سے بچو اور جماعت اور عام اہلِ اسلام کے طریقہ کو پکڑے رہو۔(مسند احمد حدیث معاذ :۲۲۱۰۷)

(ج) انکارِ تقلید: تقلید ایک عام اور کثیر الافراد عنوان ہے، جسے محمود و مذموم کے دو وسیع خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے، تقلیدِ محمود نہ صرف یہ کہ ادلۂ شرعیہ اربعہ سے ثابت ہے؛ بلکہ وہ فطرت کی پکار بھی ہے، اس کے برخلاف تقلیدِ مذموم نہ صرف یہ کہ غیر آئینی ہے بلکہ منطقی لحاظ سے بھی قبیح اور انسان کی سوچ اور فکر کی صلاحیتوں کے لئے سخت نقصاندہ ہے، غیر مقلدین کا دانستہ مغالطہ یہ ہے کہ وہ خلطِ مبحث کا ارتکاب کرتے ہوئے، بڑی بے باکی سے تقلید کی دوسری نوع کے دلائل، پہلی نوع پر چسپاں کرتے ہیں اور بے وجہ قوم کو گمراہ کرتے ہیں ،حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ (۱/ ۴۳۱۔۴۳۶) میں ایک مبحث کے ذیل میں اس مغالطہ پر تنبیہ اور اس کا رد کیا ہے، ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید شخصی کرنا، اگر اعتدال واصول پسندی کیساتھ ہو تو وہ تقلیدِ محمود کے دائرہ میں بے شبہ آتا ہے اور اگر بے جا تعصب و بے اعتدالی کیساتھ ہو تو اسے تقلیدِ مذموم قرار دینا بجا و برمحل ہے، شیخ الحدیث مولانا

سرفراز خان صفدرؒ کی اس تحریر سے تقلیدِ محمود کے حدود و مواقع پر خوب روشنی پڑتی ہے، فرماتے ہیں:

''عقائد و اصولِ دین میں تقلید جائز اور درست نہیں ہے اور نہ ہی نصوصِ قرآن کریم اور صریح و صحیح احادیث اور اجماعِ امت کے خلاف مسائل میں تقلید جائز ہے، تقلید تو ان پیش آمدہ مسائل میں جائز ہے، جو نہ تو قرآن کریم سے صراحتاً ثابت ہوں اور نہ احادیث صحیحہ صریحہ سے اور نہ اقوالِ حضرات صحابہ کرامؓ سے اور حضراتِ مقلدین کے نزدیک جس امام کی تقلید کی جاتی ہے وہ ان کو ہرگز بھی معصوم نہیں جانتے۔'' (الکلام المفید :۲۳۵)

خطیب بغدادیؒ رقمطراز ہیں: احکام کی دو قسمیں ہیں (۱) عقلی (۲) شرعی

عقلی احکام مثلاً اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی معرفت، رسول پاک ﷺ اور آپ علیہ السلام کے سچے ہونے کی معرفت، ایسے ہی اس قسم کے جو عام فہم احکام ہیں ان میں تقلید جائز نہیں، عبید اللہ بن الحسن العنبریؒ سے منقول ہے کہ اصول دین میں تقلید جائز ہے، یہ بات غلط ہے (کیوں کہ اللہ تعالی نے اسے غلط ٹھرایا ہے) چنانچہ ارشاد ہے: (لوگو) جو کتاب تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی ہے اس کے پیچھے چلو اور اپنے پروردگار کو چھوڑ کر دوسرے (من گھڑت) سرپرستوں کے پیچھے نہ چلو (الاعراف :۳) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کلام کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے۔

شرعی احکام دو طرح کے ہیں ایک تو وہ جن کے بارے میں ہر کس و ناکس کو معلوم ہے کہ یہ شریعت کا حصہ ہیں مثلاً پانچ نمازیں، زکوٰۃ، وروزہ وحج کی فرضیت کا علم اور زنا وشراب کی حرمت کا علم وغیرہ، ایسے مسائل میں تقلید جائز نہیں کیوں کہ سارے لوگ اس جاننے سمجھنے میں برابر ہیں تقلید کا یہاں کوئی معنیٰ نہیں، دوسری قسم کے شرعی احکام وہ ہیں جن میں نظر واستدلال کی ضرورت پڑتی ہے جیسے عبادات ومعاملات ونکاح وغیرہ کے فروعی مسائل، یہی دراصل تقلید کا موقع ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر تمہیں علم نہیں ہے تو جو علم والے ہیں ان سے پوچھ لو (النحل: ۴۳) عامی کو چوں کہ اجتہاد کی اہلیت نہیں ہوتی اس لئے تقلید اس کا فرض ہے جس طرح اندھے کو قبلہ کے معاملے میں تقلید کرنا ضروری ہے (الفقیہ والمتفقہ ۲/ ۱۳۱ و ۱۳۳)

قرآن کریم کی ان مندرجہ ذیل آیات سے مطلق تقلید کا ثبوت ملتا ہے، سورۃ النساء آیت :۵۹......جس میں اہلِ ایمان کو اطاعتِ خدا اور رسول کے علاوہ علماء وفقہاء کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے، سورۃ النحل:۴۳......میں ناواقف لوگوں کو واقف کار حضرات سے پوچھنے کا حکم دیا گیا ہے۔سورۃ النساء آیت:۸۳......میں خاص واقعات ومعاملات کو رسول کے علاوہ اہلِ استنباط کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی گئی تا کہ حقیقتِ حال سے عوام الناس کو آگہی حاصل ہو سکے، علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ عوام پر تقلید واجب ہے اور سورہ نحل کی یہ آیت کہ "اہل علم سے پوچھو اگر نہ جانتے ہو" انہی کے بارے میں ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں: صحابہ وتابعین سارے ایک درجہ اور مرتبہ کے نہ تھے بلکہ ان میں سے بعض مجتہد تھے اور بعض مقلد جیسا کہ خود حق تعالیٰ فرماتے ہیں: البتہ جان لیں گے ان میں سے وہ لوگ جو استنباط واجتہاد کر سکتے ہیں (النساء:۸۳-قرۃ العینین ص:۲۵۱)

احادیث سے تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی ہر دو کا ثبوت ملتا ہے، دونوں ہی طرح کے نظائر کتبِ احادیث میں موجود ہیں، بعض احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ہی صحابہ کو آسمانِ ہدایت کے ستارہ قرار دے کر، ان میں سے کسی کی بھی اقتداء کو حصولِ ہدایت کا یقینی ذریعہ بتلایا ہے (مشکوۃ باب مناقب الصحابۃ:۶۰۱۸) بعض احادیث میں خلفائے راشدین کے طریق کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی تلقین آئی ہے (ابوداؤد باب فی لزوم السنۃ:۴۶۰۷) بعض احادیث میں ابوبکرؓ وعمرؓ کی اقتدا کا حکم ہے (ترمذی باب مناقب ابوبکر:۳۶۶۲) بعض احادیث میں ابنِ مسعودؓ کی منقبت بیان کر کے، ان کے طریق کو امت کے لئے پسند فرمایا گیا۔(مستدرک حاکم: ذکر مناقب عبداللہ بن مسعود:۵۳۹۴) حضرت معاذؓ؛ اہلِ یمن کے لئے دربارِ رسالت کے فرستادہ گورنر اور معلم (استاذ) تھے (بخاری میراث البنات:۶۷۳۴) ان کی پیروی کرنا یمن کے باشندوں پر لازم وضروری تھا، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ؛ حضرت ابن مسعودؓ کے علمی مقام کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے احباب ومتعلقین کو انہی کی طرف مسائل کے سلسلہ میں رجوع کرنے کا حکم دیتے تھے۔(بخاری: باب میراث ابنۃ الابن مع بنت:۶۷۳۶) حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہا کرتے تھے: جب ہمارے سامنے حضرت علیؓ سے کوئی قول

ثابت ہو جائے تو پھر ہمیں کسی اور کے قول کی طرف جانے کی ضرورت نہیں ہے (فقہ عبداللہ بن عباس :ص ۱۹) مکہ مکرمہ والے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تقلید شخصی کرتے تھے اور آپ کا فتویٰ دینے کا معمول یہ تھا کہ کتاب وسنت کے بعد حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے اقوال پر فتویٰ دیتے، اگر ان کے اقوال سے بھی مسئلہ نہ ملتا تو اپنا قول فرماتے (دارمی ۱/۵۹-مستدرک ۱/۳۴۱-سنن کبریٰ بیہقی ۱/۱۵۵-جامع بیان العلم ۲/۵۷) مدینہ منورہ میں حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ چلتا تھا، اہل مدینہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کہہ دیا تھا کہ ہم زیدؓ کی بات چھوڑ کر آپ کی بات کو اختیار نہیں کریں گے (بخاری: باب اذا حاضت المراۃ بعد ما افاضت: ۱۷۵۸) امام غزالیؒ فرماتے ہیں: تقلید تو اجماع صحابہ سے ثابت ہے کیوں کہ وہ عوام کو فتوے دیتے اور عوام کو یہ حکم نہیں دیتے تھے کہ خود درجہ اجتہاد تک پہنچیں اور یہ بات ان کے علماء اور عوام کے تواتر سے مثل ضروریات کے ثابت ہے (المستصفی ۲/۳۸۵)

ان احادیث وآثار سے بے تکلف اتنا بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ کسی مخصوص شخص کی تقلید وپیروی کرنا گمراہی یا خدانخواستہ بدعت نہیں بلکہ سنتِ نبوی اور تعاملِ صحابہ سے اس کے نظائر موجود ہیں، البتہ جہاں تک معین طور پر ائمہ اربعہ ہی کی تقلید کا سوال ہے تو اس کے تعین کے پیچھے، کچھ قدرتی عوامل اور بعض وقتی مصالح کارفرما ہیں، قدرتی عامل تو یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کی فقہ کے علاوہ کسی اور امام کی فقہ، اس قدر احاطہ وتفصیل کیساتھ محفوظ ہی نہیں رہی ،امام اوزاعیؒ ،امام شعبیؒ ،سفیان ثوریؒ وغیرہ اکابرین کو قدرتی طور پر ایسے لائق شاگرد ملے ہی نہیں ،جن کے واسطے سے ان کی فقہ اگلے لوگوں تک منتقل ہوتی ،نتیجتاً چوتھی صدی کے ختم ہوتے ہوتے ان ائمہ کی فقہ بھی فنا ہوگئی ، اس صورتِ حال کی بناء پر امتِ مسلمہ کی عظیم اکثریت ائمہ اربعہ ہی کی تقلید کے درمیان محدود ہو کر رہ گئی اور انہی کی پیروی وتقلید سوادِ اعظم کی پیروی ٹھہری جس کا حدیث میں صریح حکم ہے اور ان سے علیحدگی وبیزاری ''شذوذ'' کا مصداق قرار پائی ،جس سے اجتناب کا صریح حکم حدیث میں موجود ہے ،ارشاد نبوی ہے:

جمعیتِ عظمیٰ کی پیروی کرو اس لئے کہ جو، جمعیت سے علیحدہ ہوا، وہ اسی علیحدگی کی شان سے جہنم رسید ہوگا (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ: ۱۷۴)

معین طور پر تقلیدِ شخصی کی وقتی مصلحت یہ ہے کہ فسادِ زمانہ، خود رائی اور نفس پرستی کے عمومی رجحان کی بنا پر تقلیدِ مطلق چونکہ بے دینی وبوالہوسی کا باعث بن رہی تھی، اس لیے مصلحتِ زمانہ یہی ٹھہری کہ آدمی کو بے لگام رکھنے کے بجائے کسی معین امام کی تقلید کا پابند بنایا جائے کہ اسی میں اس کے دین وایمان کی حفاظت وبقاوسلامتی ہے (مستفاد از حجۃ اللہ البالغۃ مع ہامشہ: باب حکایۃ حال الناس قبل المائۃ الرابعۃ ۱/۱۳۱/۴۳) یعنی اصل ماموربہ اور اوّلین مطلوب، اتباعِ حق اور ہوائے نفسانی سے اجتناب ہے، جن کا مقصود ومطلوب ہونا قرآن میں جا بجا بیان ہوا ہے، لیکن بعد کی صدیوں میں اس مطلوبِ اصلی پر عمل، تقلیدِ شخصی پر موقوف ہو کر رہ گیا، اس لئے واجبِ اصلی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، اس واجب لغیرہ پر عمل درآمد عین ضروری ہو گیا، پس واجب لغیرہ (تقلیدِ شخصی) کا انکار اور اس سے صرفِ نظر دوسرے معنوں میں واجبِ اصلی (اتباعِ حق) کو پس پشت ڈالنے کے مترادف ہوگا، جو خود گمراہی اور راہِ راست سے انحراف ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: پھر صحابہ مختلف شہروں میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک، ایک علاقے کا مقتدا بن گیا، یعنی ایک ایک علاقے کے لوگ ایک ہی صحابی کی تقلیدِ شخصی کیا کرتے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ وہ صحابہ اپنے علاقے والوں کو استنباط اور رائے سے فتوے دیا کرتے تھے (الانصاف: ۳)

(د) توہینِ اسلاف: انکارِ تقلید میں شدت اور غلو کی روش نے، بعض دریدہ دہن غیر مقلدین کو آپے سے باہر کر دیا، ان کی زبان، امتِ محمدیہ کے اس مقدس گروہ کے خلاف بھی کھل گئی ہے، جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سندِ ہدایت عطا فرمائی تھی، حضراتِ صحابہ کے جاری کردہ عمل پر ایسے بدزبانوں کے یہاں، بدعت کا اطلاق عام ہے، عام صحابہ کے اعمال پر نکتہ چینی کرنا، ان کے نزدیک کوئی غیر معمولی بات نہیں، فقہاء مجتہدین ایسے ہی مخصوص موقعوں پر ائمہ محدثین کو تنقید کا نشانہ بنانا، ان کے یہاں ایک عام بات ہے، سرخیلِ فقہاء سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین سے بغض وعناد رکھنا، ان کے نزدیک مسلکِ غیر مقلدیت میں گویا کھرے اور مضبوط ہونے کی دلیل ہے، خود غیر مقلدین کے اکابر بھی، اب اپنی پیدا کردہ صورتِ حال کے بھیانک نتائج سے حیران ونالاں ہیں، ایک

غیر مقلد عالم مولانا داؤد غزنوی سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے بڑے دردناک لہجہ میں فرمایا: جماعتِ اہل حدیث کو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی روحانی بد دعا لیکر بیٹھ گئی ہے (راہ اعتدال: ۵۵) صحاح ستہ کے مترجم نواب وحید الزماں حیدرآبادی: اپنی جماعت کے بے لگام ہونے پر ماتم کرتے ہوئے کہتے ہیں: بعضے عوام (حقیقت یہ ہے کہ بہت سے خواص کا حال بھی اس سے مختلف نہیں: رحمانؔی) اہل حدیث کا یہ حال ہے کہ انہوں نے صرف رفع یدین اور آمین بالجہر کو اہلِ حدیث ہونے کیلئے کافی سمجھا ہے باقی آداب وسنن اور اخلاقِ نبوی سے کچھ مطلب نہیں، غیبت، جھوٹ، افتراء سے (اپنے آپ کو) پاک نہیں کرتے، ائمہ مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اولیاء اللہ اور حضراتِ صوفیہ کے حق میں بے ادبی اور گستاخی کے کلمات زبان پر لاتے ہیں (راہ اعتدال: ۵۶) توہینِ اسلاف کس قدر سنگین گناہ ہے، اس پر کتاب وسنت وسیرت سے کوئی لمبے چوڑے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، عنوان خود اس طرزِ عمل کے مذموم ہونے کی مستقل دلیل ہے، اسلاف واولیاء کے معاندین سے خود باری تعالی نے اعلانِ جنگ کیا ہے (بخاری: باب التواضع: ۶۵۰۲) جو اکابر کی تعظیم وتوقیر نہیں کرتا، اس کا رسالتمآب ﷺ سے کوئی واسطہ وتعلق نہیں (مسند احمد: ۲۳۲۹) علاماتِ قیامت سے ہے کہ امت کا احسان فراموش اخیر طبقہ، خود اپنے اسلاف واولین طبقے پر لعن طعن کرے گا (مشکوۃ: باب اشراط الساعۃ: ۵۴۵۰)

(ہ) **تضلیلِ مقلدین**: تعصب وغلو پسندی کی نفسیات سے مغلوب ہوکر اپنے مخالفین پر بے دھڑک گمراہی وکفر کے فتوے لگاتے پھرنا، "ملل ونحل" کی تاریخ کے گمراہ فرقوں کا محبوب مشغلہ ومخصوص شیوہ رہا ہے، غیر مقلدین بھی اسی مکروہ روش کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں ، مشہور غیر مقلد ابوالشکور عبد القادر صاحب لکھتے ہیں کہ: خواص تو جانتے ہیں، میں عوام کی خاطر کچھ عرض کرتا ہوں: کہ مقلدین موجودہ دس وجھوں سے گمراہ اور فرقہ ناجیہ سے خارج ہیں، جن سے مناکحت جائز نہیں، وجہِ اول یہ ہے کہ موجودہ حنفیوں میں تقلیدِ شخصی پائی جاتی ہے، جو سراسر حرام اور ناجائز ہے (کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے: ۴۵) نواب وحید الزماں حیدرآبادی، غیر مقلدین کے اس طرزِ عمل کا رونا روتے ہوئے لکھتے ہیں: اپنے سوا تمام

مسلمانوں کومشرک اور کافر سمجھتے ہیں، بات بات میں ہر ایک کو کافر اور مشرک اور قبر پرست کہہ دیتے ہیں (راہ اعتدال: ۵۷) مدعیانِ عمل بالحدیث کو ان مندرجہ ذیل احادیث کی روشنی میں اپنے کردار وعمل کا جائزہ لینا چاہیے؛ ارشاد نبوی ﷺ ہے: کوئی شخص کسی پر فسق وکفر کا الزام لگائے اور وہ اس کا حقدار نہیں تو خود کہنے والا فاسق وکافر ہو جاتا ہے؛ جو شخص کسی کے ساتھ کافر کہہ کر مخاطب ہو یا اسے اللہ کا دشمن کہے اور وہ ایسا نہ ہو تو یہ بری نسبتیں خود اسی کی طرف لوٹ آتی ہیں؛ جو شخص کہتا ہے کہ لوگ ہلاک وبرباد ہوئے (مستحق نار ہوئے) تو درحقیقت وہ خود ہی ایسا ہوتا ہے (مشکوۃ: باب حفظ اللسان: ۴۸۱۶۔۴۸۱۷۔۴۸۲۱)

نہایت ہی اختصار کیساتھ یہاں اس مضمون میں موجودہ غیر مقلدین کے اصول وکردار کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے، غور کرنے سے قارئینِ کرام پر یہ حقیقت یقیناً واشگاف ہوگی کہ انکارِ تقلید ایک ایسا زینہ ہے، جس کے واسطہ سے ایک سیدھا سادھا انسان یکے بعد دیگرے نہ صرف مسلماتِ شرعیہ کا انکار کر بیٹھتا ہے بلکہ خواہ مخواہ ان کے (مسلمات شرعیہ مثلاً اجماع، قیاس، عظمتِ اسلاف وغیرہ کے) قائلین سے بھی عداوت مول لیتا ہے، یہ سلسلہ رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھتا ہے کہ آدمی ایک وقت العیاذ باللہ العظیم اسلام ہی کو سلام کر بیٹھتا ہے، چنانچہ غیر مقلدین کی تاریخ ایسے نامسعود ولرزہ خیز واقعات سے بھری پڑی ہے، مرزا غلام احمد قادیانی، عبداللہ چکڑالوی، سرسید احمد خان، ڈاکٹر احمد دین، نیاز فتحپوری، عنایت اللہ مشرقی، علامہ تمنا عمادی، غلام احمد پرویز، مولوی اسلم جیراج پوری، یہ چند افراد کے نام ہیں، جو ترکِ تقلید ہی کر کے اپنی عاقبت برباد کر بیٹھے، معروف غیر مقلد عالم محمد حسین بٹالویؒ نے بجا کہا ہے: پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کیساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں، وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، کفر وارتداد وفسق کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں، مگر دین داروں کے بے دین ہو جانے کے لئے، بے علمی کے ساتھ ترکِ تقلید بڑا بھاری سبب ہے، گروہِ اہلِ حدیث میں جو بے علم یا کم علم ہو کر ترکِ تقلید کے مدعی ہیں، وہ ان نتائج سے ڈریں اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہو جاتے ہیں (رسالہ اشاعت السنۃ ۱۸۸۸ء نمبر۲ صفحہ ۱۱)

معجزات پر ایک اصولی نظر

معجزہ کی تعریف

معجزہ اس خارق عادت معاملے کو کہا جاتا ہے، جو مدعی نبوت کے ہاتھ پر اس کی تصدیق اور اس کے مخالفین پر حجت قائم کرنے کے لئے ظاہر ہوتا ہے، قرآنی اصطلاح میں اس کو آیات وبراہینِ نبوت کہا جاتا ہے' چنانچہ سورۂ قصص:۳۲؛ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو بڑے معجزے ''عصا اور ید بیضاء'' عطا کر کے ان سے کہا گیا تھا: **فذٰنک برھانان من ربک** ''یہ دو زبردست دلیلیں ہیں جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہیں'' ایسے ہی سورۂ اعراف:۱۳۳؛ میں رسالتِ موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کے لئے بھیجی گئیں، پانچ علامتوں پر ''**آیات مفصلات** '' کا لفظ بولا گیا ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں بھی ان کے لئے آیات ہی کا لفظ مستعمل ہے؛ ارشاد ہے: ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانیاں دیں۔ (بنی اسرائیل:۱۰۱)

معجزہ کی ضرورت

انسان کی فطرت شروع ہی سے پیکرِ محسوس کی خوگر رہی ہے، انسان چوں و چرا کئے بغیر صرف انہی حقائق کے تسلیم کرنے کا عادی ہے، جو از قبیلِ محسوسات ہیں، معقولانہ حقائق کے سلسلہ میں اس کی طبیعت یہ ہے کہ وہ ان کو تب ہی مانتا ہے، جب کہ ان کا مبدأ محسوسات ومشاہدات ہوں، خالص عقلی امور کو کسی تردد وشک کے بغیر تسلیم کر لینا، اس کے بس سے باہر ہے، مغیبات کا تعلق تو ماورائے عقل سے ہوتا ہے، انسان آسانی کے ساتھ ان کو کیسے مان لے گا' انبیاء کرام کی بیشتر تعلیمات کا تعلق انہی مغیبات سے ہوتا ہے، وہ زیادہ تر اس فانی دنیا کے تصور سے بلند ہو کر گفتگو کرتے ہیں۔

ان کی تعارف کردہ ذاتِ یعنی ذاتِ خالقِ کائنات کی عینیت، انسان کی نظر سے پوشیدہ ہوتی ہے، جس عالم اور اس عالم کے جن وقائع کی وہ اطلاع دیتے ہیں وہ سراسر پردۂ غیب میں ہوتے ہیں، انسان کی متجسسانہ سرشت سے یہ امید رکھنی قطعاً ناممکن تھی کہ وہ ان تعلیمات

کو سر آنکھوں پر رکھ لے گا، فکر وفہم کی تسلی کیے بغیر، اس قدر جرأتمندانہ اقدام کی توقع اس سے کب کی جاسکتی تھی؟ پس معجزات کا سلسلہ اسی حجت کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے، پچھلی امتوں نے ایک سے زائد بار اپنے نبیوں سے اس طرح کے آیات ومعجزات کا مطالبہ کیا تھا اور بیشتر مرتبہ ان کے مطالبات کو پورا کیا گیا تھا، اس لحاظ سے معجزہ کے دورخ ہوتے ہیں، ایک طرف تو وہ دلیلِ نبوت ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کی حیثیت اتمامِ حجت کی ہوتی ہے۔

معجزہ کا ردعمل

معجزات کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے بعد اس کا انکار، عناد وطغیان کہلاتا ہے، اس کا انجام سوائے ہلاکت وبربادی کے کچھ نہیں ہوتا، منکرین معجزات کے سلسلہ میں اللہ تعالی کی یہ قدیم سنت رہی کہ ان کی مہلت ختم کر دی جاتی ہے اور بہت جلد انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے، بااعتماد طریقوں سے ان معجزات کی تفاصیل پہنچنے کے بعد ان میں تاویل کرنا، عقل کی کسوٹی پر ان کو پرکھنا، تشکیک اور ملحدانہ ذہنیت کی نمائندگی کرتا ہے، بسا اوقات معجزات کے سلسلہ میں ان کی خرد برد اور ان کی ملحدانہ موشگافیاں عام ذہنوں کو بھی متاثر کر دیتی ہیں، جس کی بناء پر وہ بھی معجزات کو محال دیکھتے ہیں؛ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصولی حیثیت سے معجزات کی معقولیت وموزونیت پر مختصر گفتگو کی جائے، معجزات کو فہم سے نزدیک کرنے کے لئے ان ذیل مقدمات پر گفتگو ضروری ہے۔

(الف) انسان کے لئے خوارق عادت کیا بالکل نامانوس ہوتے ہیں؟

(ب) خوارق عادت صرف مخلوق کے اعتبار سے ہوتے ہیں یا خالق کے اعتبار سے بھی یعنی سلسلہ اسباب وعلل کیا خالق کے لئے بھی ہے یا صرف مخلوق کے لئے؟

(ج) کیا اسباب ومسببات میں لزومِ عقلی ضروری ہے؟

(د) آیاتِ الوہیت اور آیاتِ نبوت کا باہمی ربط

(الف) خارق عادت کسی ایسے واقعہ کو کہا جاتا ہے، جو دنیا کے عام نظام سے ہٹ کر ہو، اس کا سبب خواہ بظاہر موجود ہو یا نہ ہو، دنیا نے ایسے خارق عادت واقعات بکثرت دیکھے ہیں، ہر چند سال میں سورج یا چاند کو گہن لگ جانا ایک خارق عادت واقعہ ہے، جو عام نظامِ شمسی

وقمری سے انحراف کہلاتا ہے، حیوانات کے توالد وتناسل کے سلسلہ میں عام قانون یہ ہے کہ دوصنفوں کے اتصال سے پیدائش ہوتی ہے مگر اب بھی چند حشرات الارض ایسے ہیں، جو بلا کسی صنفی اتصال کے پیدا ہوتے ہیں، حیوانات کی شکل وساخت کا ایک عام معیار ہے، آج بھی دنیا اس کا مشاہدہ کرتی ہے کہ اس معیار سے کبھی انحراف پایا جاتا ہے اور عجیب الخلقت حیوان معرضِ وجود میں آتا ہے، اس لحاظ سے محض خارق عادت ہونے کے بناء پر معجزات کا انکار یا ان میں تاویل کرنا، ایک اصولی غلطی ہے۔

(ب) کسی بھی شئے کے عادی یا غیر عادی ہونے کا تعلق ہمارے اعتبار سے ہے، خالق کی نظر میں دونوں برابر ہیں، ہم چوں کہ شروع ہی سے ایک طئے شدہ نظام دیکھتے چلے آرہے ہیں، اس لئے ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یہی عادی نظام ہے، اس کے جو خلاف ہوگا، وہ غیر عادی ہے، مثلاً شروع ہی سے ہم انسان کی پیدائش میں دوصنفوں کا اشتراک دیکھتے چلے آرہے ہیں، اس لئے ہمارا اس پر اصرار ہے کہ یہی عادی نظام ہے ، بالفرض اگر شروع ہی سے دنیا کی یہ عادت چلی آتی کہ بلا کسی جنسی اتصال کے صنف واحد سے انسان کی پیدائش ہوتی تو ضرور ہم اسے نظامِ عادی کہتے اور اس کے خلاف کو نظامِ غیر عادی کا نام دیتے۔

اللہ کے حق میں تو دونوں برابر ہیں، ان میں سے کسی میں بھی کسی طرح کا استبعاد نہیں، اس کے نزدیک تو توالد وتناسل کے ممکنہ طریقے یکساں طور پر برابر ہیں، چنانچہ انسانی دنیا کا آغاز اس نے مطلق کسی صنف کے بغیر کیا ہے، پھر دوسرے انسان کی پیدائش صنف مذکر سے ہوئی ہے، اس کے بعد دوصنفوں کے وساطت سے یہ سلسلہ چلایا تا آنکہ دنیا کی درمیانی عمر میں ایک بار پھر اپنی قدرتِ مطلقہ کا اظہار فرمایا کہ ہم انسان کی تخلیق میں نہ کسی مادہ کے پابند ہیں اور نہ کسی مخصوص طریقہ کے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش صرف صنفِ مؤنث کے ذریعہ ہوئی ہے، غرض اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کردیا کہ ہمارے نزدیک تخلیق کے یہ چاروں طریقے مساوی اور یکساں نوعیت رکھتے ہیں، چاروں پر یکساں لحاظ سے ہم کو قدرت حاصل ہے۔

اسباب وعلل کا یہ ظاہری سلسلہ انسان کے لئے اس قدر مغالطہ خیز ثابت ہوا ہے کہ وہ اس محدود گردش سے ہٹ کر سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں، آگ ہو تو اس کا خاصہ، احراق (جلانا) ہی کو تسلیم کرے گا، آگ ہو اور احراق نہ ہو یا برودت و سلامتی ہو اور آگ بھی ہو، انسان اس کو کبھی نہیں مانے گا، سمندر ہو تو اس کا خاصہ سیلان اور بہاؤ ہی قرار دے گا، سمندر ہو اور پانی کے دیوار نما راستے ہوں، انسان اس کو تسلیم نہیں کرے گا، آخر معجزات کا انکار کرنے والوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عبورِ دریا اور فرعون کے غرق کو اسی مغالطہ کی بناء پر سمندر میں جوار بھاٹے کا کرشمہ اور مدو جزر کا کھیل قرار دیا ہے، انسان کا طرہ یہ ہے کہ وہ اسباب وعلل کے اس سلسلہ وضابطے سے خالقِ اسباب وعلل کو بھی خارج نہیں مانتا، اسے اصرار ہے کہ وہ بھی اسی گردش کا پابند ہے، یہ کھلی دہریت اور الحاد نہیں تو اور کیا ہے۔

(ج) اسباب وعلل کے اس سلسلہ پر اصرار اس وقت مزید کھوکھلا ہو جاتا ہے، جب کہ اسباب ومسببات کے مابین لزوم عقلی کا انکار خود ان کے تسلیم کردہ محققین کی جانب سے کیا جاتا ہے، آئن اسٹائن بیسوی صدی کا بڑے پایہ کا محقق ہے، وہ کہتا ہے کہ خود اس کائنات کے لحاظ سے اسباب ومسببات میں ایسا لزوم نہیں کہ سبب کے پائے جانے پر مسبب ضرور ہی آموجود ہو یا یہ کہ سبب کے بغیر مسبب نہ پایا جائے؛ ایسا ممکن ہے کہ سبب ہو مسبب نہ ہو، اسی طرح ہوسکتا ہے کہ مسبب، سبب کے بغیر ہی آموجود ہو، غرض آئن اسٹائن کی اس تحقیق کے بعد جس کو نظریۂ اضافت کا نام دیا جاتا ہے، کائنات کی میکانکی تعبیر اور نیچر کے نظریات قطعی طور پر غلط ثابت ہوتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تکملۃ فتح الملھم: ۴/۴۷۵)

ایک اور سبق آموز کتاب ”میرے والد میرے شیخ“ میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اپنے والدؒ کی تحقیق پیش کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

”فرمایا کہ فلاسفہ بہت سی چیزوں کو جو لازمِ ذات یا لازمِ ماہیت قرار دیا ہے یہ واقعہ کے بالکل برخلاف ہے، حقیقت میں مخلوقات کی کوئی صفت نہ لازمِ ذات ہوتی ہے نہ لازمِ ماہیت اور جس چیز کو فلاسفہ لازمِ ذات یا لازمِ ماہیت قرار دیتے ہیں وہ درحقیقت اس ذات یا ماہیت کی صفات عارضہ ہوتی ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ، ذات یا اس ماہیت کے ساتھ اکثر پیدا فرما دیتے

ہیں، ان کے وجود وعدمِ وجود میں نہ اس ذات یا ماہیت کا کوئی دخل ہوتا ہے اور نہ وہ اس کے لئے ایسی لازم ہوتی ہے کہ ان کا انفکاک (علیحدہ ہونا) اس ذات یا ماہیت سے ممکن نہ ہو، چنانچہ یہ کہنا تو درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگ میں احراق کی خاصیت پیدا فرمادی ہے؛ لیکن احراق کو آگ کا لازمِ ماہیت قرار دینا درست نہیں، چنانچہ اگر کسی آگ میں اللہ تعالیٰ احراق کی تخلیق نہ فرمائیں تو آگ کا بغیر احراق کے پایا جانا ممکن ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں ہوا، اگر یہ بات ذہن میں رہے تو معجزات میں جو عقلی استبعاد نظر آتا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے دور ہوجائے، یہ بات احقر نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف عنوانات اور مختلف اسالیب کے ساتھ اتنی مرتبہ سنی کہ دل پر نقش ہوگئی، اس کے بعد ایک مرتبہ میں عہدِ حاضر کے معروف مفکر سر جیمس جینیز کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا، اس میں اس نے اس نظریہ کو بڑے شرح وبسط کے ساتھ ثابت کیا ہے اور لکھا ہے کہ آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافت کے بعد سے کائنات کی میکانکی تعبیر اور نیچر کے نظریات قطعی طور پر غلط ثابت ہوئے ہیں اور جدید تحقیقات کی رو سے اشیاء کی کسی ایسی خاصیت کا کوئی وجود نہیں ہے' جسے اس کا لازم ذات یا لازم ماہیت کہا جاسکے۔ (میرے والد میرے شیخ: ۴۰)

(د) کائنات میں جو تصرفاتِ خداوندی بغیر کسی واسطہ کے روپذیر ہوتے ہیں، انہیں ''آیاتِ الوہیت'' کہا جاتا ہے، جیسے زمین کو نوعِ انسانی کی سکونت ورہائش کے قابل بنادینا، بلند قامت پہاڑوں کے ذریعہ اس کی میخ کنی کرنا، اس کے پیٹ میں بے تحاشا چشمے وسوتے اور دریا وسمندر جاری کردینا، اس کے اوپر سڈول سا نیلگوں چھت کسی سہارے وستون کے بغیر قائم کردینا، آسمان وزمین کے مابین بے شمار ستارے اور بادلوں کو معلق کردینا وغیرہ وغیرہ اور جو تصرفاتِ خداوندی نبوت کے واسطے سے کائنات میں روپذیر ہوتے ہیں، انہیں ''آیاتِ نبوت اور شاہدِ صدق'' کہا جاتا ہے، فرق صرف واسطہ اور بلاواسطہ کا ہے، ورنہ دونوں اس کلیہ میں مشترک ہیں کہ ان کا تعلق براہِ راست تصرفاتِ خداوندی سے ہے اور دونوں ہی اس کے نظامِ قدرت کے تابع ہیں، پس جو شخص آیاتِ الوہیت کو مانتا ہے؛ اس کے لئے آیاتِ نبوت کا تسلیم کرنا چنداں مشکل نہیں ہے، آیاتِ الوہیت کے ماننے کا منطقی نتیجہ

آیاتِ نبوت کی تصدیق ہے، اس اعتبار سے آیاتِ نبوت کا انکار اگر کوئی منکرِ خدا کرتا ہے تو اس کا انکار بجا ہے کہ ابھی وہ شعور وادراک کے عہدِ طفولیت میں ہے، ہستی کا ادراک ابھی اسے حاصل نہیں ہوا ہے، اسباب ومسببات کے ظاہری ربط سے دھوکا کھا کر اس نے نظامِ عالم ایک بے جان چیز ''مادہ'' اور'' فطرت'' کے حوالے کر رکھا ہے، لہذا انکار معجزات کے سلسلہ میں وہ بدنصیب معذور ہے؛ البتہ آیاتِ نبوت کا انکار کوئی قائلِ خدا کی جانب سے کیا جاتا ہے تو یہ ایک ایسا کھلا تضاد ہے جس کی کوئی تاویل سوائے خبط وجنون کے نہیں کی جاسکتی۔

معجزات کی خصوصیت

معجزہ کی سب سے بڑی خصوصیت اور معجزہ کا سب سے نمایاں وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ تاقیامت معجزہ ہی باقی رہتا ہے، ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ممکن ہوگا کہ معجزہ ایک زمانہ میں تو معجزہ رہے اور بعد میں وہ ہرکس وناکس کا مشغلہ بن جائے، زمانہ چاہے کتنا ہی آگے بڑھ جائے اور وسائل وتمدن میں چاہے کتنی ہی ترقی ہوجائے، معجزہ کی مادی توجیہ نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوسکتی ہے، مثال کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا اژدہا بن جانا، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں معجزہ تھا وہ بعینہٖ آج بھی معجزہ ہی برقرار ہے، رسالت مآب ﷺ کی انگشت مبارکہ کے اشارے سے چاند کے دوٹکڑے ہونا، جس طرح آج سے قریب ساڑھے چودہ سو سال قبل معجزہ تھا، بعینہٖ اسی طرح آج بھی وہ معجزہ ہے، لاٹھی اور اژدہا، اشارۂ انگشت اور شقِ قمر کے درمیان نہ اس وقت علاقہ تاثیر معلوم کیا جاسکا اور نہ ہی آج تک اس کا سراغ دستیاب ہوسکا ہے۔

معجزہ کے اقسام معجزہ کی دوقسمیں ہیں ۱۔حسی ۲۔معنوی

معجزات حسیہ

ان معجزات کو کہا جاتا ہے جو خارج میں محسوس ومشاہد ہوسکتے ہوں؛ معجزۂ شق القمر، معجزۂ رمی حصاۃ یعنی مٹھی بھر کنکریوں کا بارود کے طوفان جیسا کام کردینا، اشیاءِ خوردنی میں اضافہ وبرکت کے متعدد معجزات، انگشتانِ مبارکہ سے پانی کے بہہ پڑنے کا معجزہ، ان تمام معجزات کا تعلق معجزات حسیہ سے ہے، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان معجزات کا ادراک واحساس ہرکس وناکس کرسکتا ہے۔

معجزات معنویہ

ان معجزات کو کہا جاتا ہے جو ازقبیلِ معنویات ہوتے ہیں، حس ومشاہدہ بآسانی اس کا ادراک نہیں کرسکتے، معجزاتِ معنویہ کا سب سے نمایاں فرد خود نبی کی ذات ہوتی ہے، ان کا ادراک ہر وہ فرد کرسکتا ہے، جس میں بصیرت کی کچھ رمق باقی ہو، یوں تو آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی خود سراپا معجزہ ہے، آپ ﷺ کی ہر حرکت وعمل اور آپ ﷺ کے ہر قول وفعل سے اعجاز ہی اعجاز ٹپکتا اور چھلکتا ہے، آپ ﷺ کی ان ستودہ صفات میں کوئی فرد بشر آپ ﷺ کی ہمسری نہیں کرسکتا، اس نقطۂ نظر سے آپ ﷺ کے معجزات کی تعداد نہ صرف ان گنت ہے بلکہ ناقابل شمار ہے، تاہم آپ ﷺ کے وہ معجزات جن کو دنیا بھی معجزہ تسلیم کرتی ہے، سند وثبوت کی کڑی رعایت کے باوجود تین ہزار سے متجاوز ہیں (فتح الباری: ۳۷۶/۶) بلکہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ہر معجزہ اپنی ذات میں کئی ایک اعجازی پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے، حافظ ابن تیمیہؒ جیسی مبالغہ بازی سے کوسوں دور شخصیت کا کہنا ہے کہ تنہا آپ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ یعنی قرآن کریم دس ہزار معجزات پر مشتمل ہے، قرآنِ کریم میں بشمول انبیاءِ سابقین کے واقعات کے، کئی ایک ایسے تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں، جس کا صحیح سراغ اور جن کی جزوی تفصیلات تنہا قرآن ہی سے معلوم کی جاتی ہیں، اصحابِ کہف کے حالات، ذوالقرنین کا تذکرہ، حضرت یوسف علیہ السلام کی مفصل رودادِ زندگی، یہ سب ایسے قرآنی حقائق ہیں جن کے استناد کی گواہی خود اس وقت کے نامور اہلِ کتاب نے دی تھی، مستقبل میں رونما ہونے والے متعدد واقعات کی پیشین گوئیاں، بعث بعد الموت کے مفصل حالات یہ تمام وہ قرآنی امور ہیں، جو آپ ﷺ کی نبوت پر گویا آیاتِ بینات ہیں، اسی طرح واقعہ معراج کے ایک معجزہ پر غائرانہ نظر ڈالئے، کہنے کو تو وہ ایک معجزہ ہے مگر معجزات کے ایک انبوہ کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

آپ ﷺ کے بڑے معجزات

آپ ﷺ کے جملہ حسی ومعنوی معجزات میں سب سے اعلیٰ وبرتر معجزہ قرآن مجید ہے، یہ

آپ ﷺ کا مخصوص معجزہ ہے، نہ اس سے قبل کبھی کسی نبی کو ایسا معجزہ دیا گیا تھا اور نہ قیامت تک کوئی اس کا مثل لاسکتا ہے، اعجازِ قرآنی پر ابتداء اسلام سے آج تک لکھا جارہا ہے اور ہر اگلے دن اس کے اعجاز میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے صفت ہائے اعجاز، جلوۂ شہود پر مسلسل آتے جارہے ہیں، بعض نامور زبان دانوں نے قرآن کریم کا مثل لانے کی کوشش کی تھی، سورۃ القارعۃ اور سورۂ فیل کے انداز پر انہوں نے کچھ بے ڈھنگے اور مہمل سے جملے گھڑے تھے مگر وہ اس قدر مضحکہ خیز تھے کہ خود ادبی دنیا نے ان کی ہنسی اڑائی ہے، نامور ادیب اور ماہر انشاء پرداز عبداللہ بن المقفع (مترجم کلیلہ ودمنہ، متوفی: ۱۴۳ھ) نے بھی اس سلسلہ کی ناکام کوشش کی تھی، کئی ماہ دماغ پاشی کرنے کے باوجود قرآن کریم کی آیات کے مقابلہ میں کوئی ایک جملہ بھی نہیں بناسکا، آخر اس کے کانوں میں ایک بچے کی زبان سے سورہ ہود کی یہ آیت پڑی: ’’وقیل یا ارض ابلعی مائک ویسماء اقلعی ‘‘تو بے ساختہ چونک پڑا اور کہنے لگا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا معارضہ ناممکن ہے اور یہ ہرگز انسان کا کلام نہیں‘‘ (روح المعانی ۲۶۱/۶۔سورۃ ھود:۴۴) یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مذکورہ بالا آیت قرآن پاک کی بلیغ ترین آیت ہے، جس میں اہل بلاغت کے مطابق فصاحت وبلاغت کی بیس صنعتیں جمع ہیں، جبکہ آیت کے کلمات کی تعداد صرف سترہ ہے، علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: ہمارے شیخ علاء الدینؒ نے اپنے ایک رسالہ میں اس آیت کی ڈیڑھ سو فنی خصوصیات شمار کرائی ہیں (روح المعانی ۲۶۵/۶) تفصیل کا یہاں موقع نہیں، اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جاچکی ہیں، انہیں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

حسی معجزات میں آپ ﷺ کا سب سے عظیم اور آفاقی معجزہ غالباً شق قمر ہوسکتا ہے، جس کے مشاہدہ کا محل جزیرۃ العرب کے چھوٹے سے شہر تک محدود نہ تھا، بلکہ اس وقت کی موجودہ پوری دنیا مشاہدہ کرسکتی تھی، چوں کہ اس معجزہ کا ظہور رات کا ایک حصہ گذر جانے کے بعد ہوا تھا، جو کہ ایک بڑی مخلوق کے خوابِ نیم شبی میں محو رہنے کا وقت ہے، اختلاف مطالع کی بنا پر اوقات میں تفاوت بلکہ دن اور رات کا فرق بھی یقینی ہے، موسم کے حساب سے مطلع کا صاف یا ابر آلود ہونا بھی طئے ہے، مزید یہ کہ اس زمانے میں تاریخی واقعات کے ریکارڈ کا بھی

کوئی آج جیسا منظّم نظام بھی موجود نہ تھا، ان چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ معجزہ دنیا کی معروف کتبِ تاریخ میں اتنی شہرت نہ پاسکا، جتنا کہ پانا چاہئے تھا، تاہم اس کے باوجود متعدد تاریخی وستاویزات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ جزیرۃ العرب سے باہر بھی اس معجزہ کا لوگوں نے مشاہدہ کیا تھا۔

''تاریخِ فرشتہ'' ہندوستان کی تاریخ پر ایک معتبر ومستند کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں ہے کہ تیسری صدی کے اوائل میں عرب کے مسلمانوں کی ایک جماعت نے ''جزیرۂ سراندیپ'' کا رخ کیا، ہوا کے رخ نے انہیں جنوبی ہند کے صوبہ ملیبار پہنچادیا، وہاں کے ایک شہر'' گندگلور'' میں وہ داخل ہوئے، شہر کا حاکم ''سامری'' ایک ذی علم، عقل منداور بااخلاق بادشاہ تھا، اس نے عرب کے مسلمانوں کا استقبال کیا، اسلام اور اسلام کی تعلیمات کے بارے میں سوالات کیے، اثنائے گفتگو معجزۂ شق القمر کا تذکرہ آیا تو وہ چونک گیا، فوراً اپنے منشیوں کو حکم دیا کہ: اس کے آباء واجداد کے دفاتر تلاش کریں، جن میں اہم وقائع قلم بند کیے گئے تھے ، چنانچہ تلاش کیے جانے کے بعد معجزۂ شق القمر کے تذکرہ کی تلاش کے لئے ورق گردانی کی گئی ، اس میں صاف مسطور تھا کہ: فلاں فلاں رات کو چاند دوٹکڑوں میں شق ہوا تھا، پھر کچھ دیر بعد اپنی اصلی ہیئت پر لوٹ آیا! یہ پڑھنا تھا کہ حاکم ملیبار اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا، یکلخت اسلام لے آیا، شیخ غلام محمد راندیریؒ کے مطابق ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب ''مہابھارت'' میں اس معجزہ کا ذکر ہے، حافظ ابن کثیرؒ کے مطابق کئی ایک مسافرین نے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں ایسے ہیکل کا مشاہدہ کیا ہے جس پر یہ تحریر تھا کہ اس کی تعمیر شق القمر کی رات کو ہوئی (تاریخ فرشتہ ۲/ ۴۸۸-۴۸۹ - تکملۃ فتح الملہم: ۶/ ۱۴۲-۱۴۳)

معجزاتِ نبوی ﷺ کا تفوق وامتیاز

رسالت مآب ﷺ کی رسالت جس طرح جامعیت وکمال کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، آپ ﷺ کے معجزات بھی اسی طرح جامعیت وکمال میں اپنی مثال آپ ہیں، جس طرح رسالت ونبوت میں آپ ﷺ دیگر انبیاء پر فائق ہیں، آپ ﷺ کے معجزات بھی دیگر انبیاء کے معجزات پر فوقیت رکھتے ہیں، حضرت نانوتویؒ ''حجۃ الاسلام'' میں دوسرے انبیاء علیہم السلام

کے معجزات پر آپ ﷺ معجزات کی برتری ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں پتھر میں سے پانی نکلنے پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسم مبارک موسوی کا یہ کمال تھا اور آپ ﷺ کی انگشتانِ مبارک سے پانی نکلنے میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ دستِ مبارک محمدی ﷺ منبع فیوض الانہار ہے .... علی ہذا القیاس کنوئیں میں آپ ﷺ کا لعابِ دہن ڈالنے سے پانی کا زیادہ ہو جانا، آپ ﷺ کے کمالِ جسمی پر دلالت کرتا ہے اور فقط یونہی روٹیوں کا زیادہ ہو جانا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کمالِ جسمی پر دلالت نہیں کرتا.......... ہاں یہ مسلم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے ان امور کا ظہور میں آنا، ان کے تقرب پر دلالت کرتا ہے اور اسی وجہ سے ان کا معجزہ سمجھا جاتا ہے۔۔۔اسی طرح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ہاتھ لگانے سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ اور بگڑی ہوئی آنکھ کا اچھا ہو جانا، بیماریوں کے یونہی اچھے ہو جانے سے کہیں زیادہ ہے ؛ کیوں کہ وہاں تو اس سے زیادہ کیا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہتے ہی بیماریوں کو اچھا کر دیا، کچھ برکت جسمانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں پائی جاتی اور یہاں دونوں موجود ہیں۔(حجۃ الاسلام: ۴۲/۴۳) امام بیہقیؒ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے فرمایا: جو معجزات آنحضرت ﷺ کو عطا کیے گئے وہ کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے، اس پر راوی کہتا ہے کہ میں نے کہا: عیسی علیہ السلام تو مردوں کو زندہ کرتے تھے، اس پر امام شافعیؒ نے فرمایا: آنحضرت ﷺ کو اس کے مقابلہ میں یہ معجزہ دیا گیا کہ منبر بننے سے پہلے، جس ستون سے لگ کر آپ ﷺ خطبہ دیا کرتے تھے، جب آپ ﷺ نے اس کے بجائے منبر پر خطبہ دینا شروع کیا تو وہ ستون نالہ وفغاں کرنے لگا، یہاں اس کے رونے کی آواز صحابہؓ نے بھی سنی اور یہ مردہ کو زندہ کرنے سے بڑھ کر تھا؛ کیوں کہ حیات، جسمِ انسانی کی صفت ہوسکتی ہے، مگر اس شعور کی حیات، جمادات کی صفت نہیں۔(البدایہ والنہایہ: ۶/۱۳۲)

اس مضمون کی تحریر وترتیب میں علاوہ دیگر کتب کے خاص طور پر ''ترجمان السنہ'' جلد چہارم، مصنفہ مولانا بدر عالم میرٹھی، ''اسلام اور معجزات''، مصنفہ شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی سے استفادہ کیا گیا۔

آبروئے اِسلام حضراتِ صحابہ کرامؓ

نسبت وصحبت دو ایسے عوامل ہیں جو کسی انسان کی کی تربیت وشخصیت سازی میں اور قدر و منزلت کے میدان میں کیمیا اثر رکھتے ہیں، منسوب الیہ کی عظمت منسوب کی عزت افزونی کا باعث ہوتی ہے اور مصاحَب کی صحبت کے اثرات مصاحِب میں منتقل ہوتے ہیں یہ تعلق کبھی اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ ایک کی عظمت وتوقیر دوسرے کے احترام کے مترادف اور ایک کی گستاخی وبے ادبی دوسرے کی اہانت کے ہم معنی ہوتی ہے، یہ نسبت ہی کا کرشمہ ہے کہ بیت اللہ آغازِ دنیا ہی سے مخلوق کا قبلہ وکعبہ اور روئے زمین کے دیگر خطوں سے مبارک ومحترم قرار پایا اور یہ نسبت ہی کی کارستانی ہے کہ گوشت پوست کی بنی، صرف ایک اونٹنی کی بے حرمتی عذابِ خداوندی کی آمد کا پروانہ اور ایک پوری قوم کی ہلاکت کا پیش خیمہ بنی، یہ صحبت ہی کی برکات ہے کہ سگِ اصحابِ کہف کو تاقیامِ قیامت، شہرت وجاودانی نصیب ہوئی، غرض نسبت جس قدر عالی اور صحبت جتنی کامل ومکمل ہوگی منسوب ومصاحب اسی تناسب سے عزت وتکریم کے لائق ہوگا۔

یہ امر اہلِ ایمان کے نزدیک ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ پوری کائنات میں رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ اقدس ہی افضل واکمل ترین ہے مربیانہ نقطۂ نظر سے اور رجال سازی کے اعتبار سے آپ ﷺ کا کوئی ثانی اور نظیر نہیں، لمحہ بھر کی صحبت اور پل بھر کی رؤیت بھی سینکڑوں نیک سرشتوں کے ایمان وانقلاب کا باعث بن گئی، صحبت ونسبت کی یہ تاثیر کچھ اس قدر معجزانہ تھی کہ اس دولت کا ہر نصیبہ ور اپنی جگہ صاحبِ بزم اور سینکڑوں کی ہدایت کا سرچشمہ اور قلب ونگاہ کی ٹھنڈک کا سامان تھا ؎

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

تاریخِ اسلام میں یہ مقدس گروہ، صحابہ کرام کے باعظمت لقب سے جانا جاتا ہے، نبی

آخر الزماں ﷺ سے ان کی صحبت ومعیت کا یہ رشتہ اس درجہ مضبوط تھا کہ بحیثیتِ مجموع صحابہ کا لقب گویا ان کے لئے بجائے علم (اسم خاص) ہوگیا، یہ وہ مقدس جماعت تھی جس کی وفاداری ووارفتگی کی دہائی وشہادت غیروں نے دی، ان کا وجود بجائے خود نبوتِ حقہ کی دلیل تھا جوایک دفعہ ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہمیشہ آپ ﷺ کا ہوکر رہ جاتا، جذبۂ سرفروشی وجاںثاری کی انتہا یہ کہ ناممکنات کوتک سر کر لینے کا حوصلہ، ایفائے عہد کا یہ عالم کہ آخری سانس تک اس کی پاسداری کا خیال وتلقین، عشق وعقیدت کی معراج یہ کہ جسم سے نکلنے اور جسم سے ہوکر گزرنے والی اشیاء سے تک تعلقِ خاطر، مشن سے وابستگی کی یہ حالت کہ مال ودولت سے لے کر باپ بیٹے تک کے تمام رشتے ناطے قربان، ادب کا یہ عالم کہ نظریں بھر کر محبوب کو دیکھنا بھی دشوار، رشتہ محبت کی حمیت وغیریت کا مظہر یہ کہ ادنیٰ گستاخی پر بھی عفو وحلم کے سارے تقاضے برطرف، اطاعت واتباع کا یہ جذبہ کہ عبادات، عادات، سے لے کر اتفاقات تک کی پیروی، فدائیت ایسی کہ اپنی جان بخشی کے عوض پائے اقدس میں کانٹے کی چبھن تک ناگوار، وصال وہمنشینی کی کیفیت یہ کہ لمحہ بھر کے لئے ناگہاں جدائی بھی دوبھر اور تشویش کا باعث؛ غرض یہ چند مجمل اشارات ہیں جن میں صحابہ کرام کی فداکارانہ ومخلصانہ کارناموں کی ایک طویل داستان پوشیدہ ہے یہ حضرات درحقیقت اسلام کی عملی تصویر ہیں، چمنِ اسلام کی باغ وبہار انہیں کے دم سے قائم ہے ان سے محبت، حرارتِ ایمانی کے وجود اور سلامتِ فکر وعقل کی دلیل اور ان سے بغض وکینہ رکھنا اور ان پر نکتہ چینی کرنا، بدباطنی، گمراہی، بدخصلتی کورمغزی کا ثبوت ہے، ان سے محبت رسول سے محبت اور ان سے بغض رسول سے بغض ہے، یہ وہ پاکیزہ نفوس ہیں جن کے قلوب تقوی وطہارت سے لبریز تھے، ان کے دلوں کی تختیاں نہایت شفاف تھیں، نفسانی آلائشوں سے پراگندہ وآلودہ نہ تھیں، ان کے اخلاص ونیت پر کسی طرح کا شبہ خود آدمی کے اخلاص وایمان پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے، ان کے کارہائے زندگی کو ہدف وتنقید کا نشانہ بنانا، ایک طرف فرمانِ نبوی سے انحراف ہے اور دوسری طرف ناقد کے ذہنی اختلال اور بیمارئ خرد کی عکاس ہے بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں بعض ایسے عناصر جگہ پاچکے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے توہینِ صحابہ کے مرتکب ہیں، ایک فرقہ ایسا ہے جس کے یہاں صحابہ کی زائد

از ایک لاکھ جماعت سے سوائے اکہرے یا دوہرے ہندسے کے چند مٹھی بھر افراد کے کوئی مسلمان ہی نہیں، یہ فرقہ اس اعتبار سے سنگین اور خطرناک نہیں کہ اس کے بغضِ صحابہؓ کا پہلو واضح اور ہر ہوشمند کے لئے اجتناب ودوری کا داعی ہے، امت کے درمیان ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو صحابہ کے تعلق سے موقع شناس، مطلب برآء بلکہ خودغرض واقع ہوا ہے۔

بعض صحابہ اس کے یہاں معیارِ حق ہیں جب کہ دوسرے بعض لائق اعتناء نہیں ہیں بلکہ بارہا یہ بوالعجبی بھی دیکھنے کو ملی کہ ایک ہی قسم کے صحابہ بعض مسائل میں حجت رہے اور بعض میں نہیں، اس فرقے کے کوئی ایسے واضح اور بے لچک اصول نہیں جن کو سنجیدگی کے ساتھ برتا جاتا ہو گویا یہ لوگ جدھر ہری ادھر چری کی مثل پر گامزن ہیں، ایک طبقہ ہے جو مشاجراتِ صحابہ (صحابہ کے باہمی اختلافات) سے نالاں نظر آتا ہے، وہ ان صحابہ کو قلم وقرطاس کی عدالت میں لاکر مقدمہ بازی وفیصلہ سازی سے کام لیتا ہے، صحابہ کی ایک جماعت پر فردِ جرم عائد کرتا ہے اور دوسری جماعت کو پروانہ برأت وصداقت دینا چاہتا ہے اس کے کٹھرے میں بعض صحابہ کو بطورِ مجرم وحق تلف پیش کیا جاتا ہے اور بعض کو بصورتِ دادطلب وفریادرس یہ ایک ایسا نفوذ پذیر زہر ہے جو رفتہ رفتہ پورے صحابہ پر سے اعتماد کو متزلزل کر دیتا ہے، جب چودھویں صدی کے عام انسانوں کی طرح عوامی عدالت میں ان کے کارناموں پر آزادانہ جرح ونقد کی جائے تو یہ ضروری نہیں کہ ایک آدمی کی ماہرانہ وکالت یا کامیاب پیروی دوسرے وکیل کے یہاں بھی قابلِ قبول تشفی بخش اور قرینِ عقل ہو۔

چنانچہ یہ بدترین صورتِ حال ماضی قریب میں رونما ہوئی کہ مشاجراتِ صحابہ کے موضوع کو مہر بند رکھنے کے بجائے جب عوامی موضوع بنایا گیا اور رطب ویابس تاریخی روایات کے سہارے کھلے بندوں ان پر بحث ومباحثہ ہوا تو امت کا ایک طبقہ حب علیؓ میں بغض معاویہؓ کا مرتکب ہوا اور دوسرا ٹولہ حبِ معاویہؓ میں بغض علیؓ کا مجرم ہوا خلافت وملوکیت اور اس کا جواب حقیقت خلافت ملوکیت اس کی زندہ اور تازہ مثال ہے۔

ایک فریق حضرت علیؓ کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے موقف کو صد فیصد مبنی بر غلط اور گھناؤنا قرار دیتا ہے اس کے بالکل بالمقابل دوسرا فریق حضرت معاویہؓ کی تائید

کرتے ہوئے حضرت علیؓ کی خلافت ہی کو سرے سے غیر آئینی قرار دیتا ہے، ملاحظہ ہو: حضرت معاویہؓ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے وہ بہرِحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے انہوں نے لڑکر خلافت حاصل کی (خلافت وملوکیت: ۱۵۸) جملہ صحابہ وتابعین امتِ مسلمہ کی زمامِ قیادت وسربراہی حضرت معاویہؓ کے دستِ مبارک میں دینے اور ان سے بیعت کرنے پر بخوشی دلی آمادہ تھے، بخلاف ان کے پیش رو حضرت علیؓ کے، جنھیں زمامِ قیادت وسربراہیٔ ملت، سبائی بلوائیوں اور حضرت عثمانؓ کے قاتلوں نے اپنے زور سے دلوائی تھی اور کم وبیش نصف امت نے ان کی بیعت سے اس بناء پر انکار کردیا تھا (حقیقت خلافت وملوکیت: ۲۱۵) گورنر شام ہونے کی حیثیت سے حضرت معاویہؓ کا خون عثمانؓ کے قصاص کے لئے اٹھ کھڑے ہونا انتہائی غیر آئینی تھا (ماحصل خلافت وملوکیت: ۱۲۵) حضرت علیؓ نے بے بس ومجبوری کی بناء پر یا دانستہ حضرت عثمان کے قصاص خون سے غفلت کی (ماحصل حقیقت خلافت وملوکیت: ۱۴۴)

اندازہ لگایئے اس طرح کا مواد موجودہ سیاسی پسِ منظر میں امت کے ہاتھوں پہنچے گا تو صحابہ کرامؓ کے تعلق سے ان کے دل ودماغ میں کیا تاثر پیدا کرے گا موجودہ دور کے بدترین سیاسی ماحول میں اس کا نتیجہ بس یہی تو ہوگا کہ صحابہ کرامؓ کی ذواتِ قدسیہ اوچھے سیاسی تنقیدوں اور بے لگام مبصروں، تجزیہ نگاروں کی بے ضرورت موشگافیوں کا نشانہ بنیں گی اور یہ صورتحال رفتہ رفتہ امت میں بے دینی بے اعتمادی کے مزاج کو جنم دے گی، جس سے نہ صرف اخروی محرومی ہاتھ آئے گی بلکہ ہمیشہ کے لئے دنیاوی ترقی وعروج کی راہ ہی مسدود ہوجائے گی۔

والواقع ان التشکیک فی عدالة الصحابة رضی الله عنهم لاینتج الاالتشکیک فی الدین واصوله (تکمله فتح الملهم: ۶۱/۵)

ذیل میں مناقب صحابہ کا تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا اس لیے اختصاراً دو متعلقہ عناوین پر قدرے وضاحت کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے (۱) صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معیارِ حق ہونا (۲) مشاجراتِ صحابہؓ کے تعلق سے جمہورِ امت کا موقف۔

صحابہ معیارِ حق: معیارِ حق، نمونۂ عمل، لائقِ اتباع، بڑے گہرے معنی رکھنے والے الفاظ

ہیں، کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی تائید کے بغیر ان کے مقتضیات کو تسلیم کرلینا ناممکن ہے اس لیے ذیل کی سطور میں کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے حوالے سے صحابہ کی بابت معیارِ حق ہونے کو واضح کیا جاتا ہے۔

آیاتِ قرآنی: سورۂ توبہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اور جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب امت سے) سابق اور مقدم ہیں اور (بقیہ امت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ (ایمان لانے میں) ان کے پیرو ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب (اللہ) سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے (توبہ: ۱۰۰) علامہ ابنِ قیمؒ آیاتِ کریمہ کے ذیل میں فرماتے ہیں: ارشادِ خداوندی میں انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے صحابہ کرامؓ کے لائقِ اتباع ہونے کا حکم مذکور ہے، رضائے خداوندی کا پروانہ ہر ایک صحابیؓ اور ان کے متبع کے لیے ہے اور تمام ہی صحابہؓ اپنے بعد والوں کے اعتبار سے سابق اور مقدم ہیں، **وکل الصحابة بالنسبة الى من بعدهم** (اعلام الموقعین: ۱۶۸/۴) حافظ موصوفؒ اتباعِ صحابہؓ کے ضروری ہونے کے مضمون کو مخصوص منطقی پیرایہ میں نقل فرماتے ہیں: صحابہؓ کی اتباع رضائے خداوندی کا موجب ہے اور رضائے خداوندی کے درپئے رہنا واجب ہے پس ان کی اتباع بھی واجب اور ضروری ہے (اعلام الموقعین: ۱۶۶/۴) سورۂ توبہ ہی میں ہے: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو (توبہ: ۱۱۹) بے شمار سلف کا کہنا ہے کہ صادقین سے مراد حضراتِ صحابہ کرامؓ ہیں، کوئی آدمی خواہ کئی ایک مسائل میں ان کی اتباع کرتا ہو؛ اگر وہ کسی ایک بھی مسئلہ میں مجموعی طور پر حضراتِ صحابہؓ کی مخالفت کرتا ہے تو اس کو اس خاص مسئلہ میں صحابہؓ کی معیت وموافقت حاصل نہیں، قرآنی حکم صحابہ کرامؓ کی معیت مطلقہ یعنی کامل اور ہر ہر مسئلہ میں معیت اختیار کرنے کا ہے نہ کہ مطلق معیت کا اور کسی ایک اعتبار سے ان کی معیت پر اکتفاء کر لینے کا (اعلام الموقعین: ۱۷۰/۴)

احادیثِ نبوی ﷺ: احادیث میں بھی بڑی صراحت کے ساتھ مقامِ صحابہ کا بیان ہے، مناقبِ صحابہ کا تفصیلی بیان کتبِ احادیث کے متعلقہ ابواب میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے یہاں

صرف ان احادیث کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے جن سے بحیثیتِ مجموعی، تمام ہی صحابہ کا معیارِ حق ہونا واضح ہوتا ہے، مشہور اور زبان زد حدیث ہے، میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں، ان میں سے جن کی بھی تم اقتداء کرلو گے، راہ یاب ہو جاؤ گے، اس حدیث پر اگر چہ ائمہ فن نے سخت کلام کیا ہے حتیٰ کہ اس کو موضوع تک قرار دیا گیا ہے۔

تاہم اس حدیث کا مضمون بے شبہ ثابت ہے اور انتہائی صحیح روایات سے مؤید ہے، مسلم شریف کی معروف حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اپنا سرِ مبارک آسمان کی طرف اٹھایا اور ارشاد فرمایا: ستارے آسمان کے لیے بچاؤ اور محافظ ہیں، جب تارے مٹ جائیں گے (جھڑ جائیں گے) تو آسمان پر بھی جس بات کا وعدہ کیا گیا ہے وہ بات آجائے گی (یعنی قیامت برپا ہو جائے گی) میں اپنے صحابہؓ کے لیے بچاؤ ہوں، جب میں چلا جاؤں گا تو میرے اصحاب پر وہ وقت آجائے گا جس کا وعدہ ہے (یعنی ان کو مختلف آزمائشوں کا، جنگوں کا اور دیہاتیوں کے ارتداد کا سامنا کرنا پڑے گا) میرے صحابہؓ میری امت کے لیے ڈھال ہیں، جب میرے صحابہؓ چلے جائیں گے تو میری امت پر وہ وقت آجائے گا جس کا وعدہ ہے (بدعات وحوادث کا ظہور ہوگا، فتنوں کا زور ہوگا) (مسلم شریف مع تکملہ: ۳۰۰/۵)

حدیثِ مذکور کے ذریعہ علامہ ابن قیمؒ کا اتباعِ صحابہؓ پر استدلال، ملاحظہ ہو: اس ارشادِ گرامی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کی امت کے لیے صحابہؓ کی حیثیت ونسبت ویسی ہی قرار دی جیسی خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت وحیثیت صحابہؓ کے لیے تھی اور جیسے تاروں کی نسبت آسمان کی طرف ہوتی ہے پس تشبیہ مذکور سے جیسے اہلِ زمین کا تاروں سے ہدایت پانا اور صحابہؓ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا واجب ہونا معلوم ہو رہا ہے، ایسے ہی غیر صحابہؓ کے لیے صحابہؓ کی اتباع کا وجوب بھی مستفاد ہو رہا ہے (اعلام الموقعین: ۱۷۶/۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے: میرے صحابہؓ کی مثال کھانے میں نمک جیسی ہے (مسند احمد) یعنی کھانے کی درستگی جس طرح نمک پر موقوف ہوتی ہے، امت کی صلاح وفلاح بھی صحابہؓ ہی کی اتباع میں مضمر ہے (اعلام الموقعین: ۱۷۷/۴) اس کے علاوہ علامہ ابن القیم نے اپنی مذکورہ وقیع المرتبت تصنیف کی جلد رابع میں دسیوں وجوہات کے ذریعہ اقوال وفتاوائے صحابہؓ کی حجیت پر استدلال کیا ہے۔

اجماعِ امت: ذیل میں معتبر علماء کے نقول ملاحظہ ہوں: ابنِ کثیرؒ (متوفی: ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں: اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک سارے صحابہ کرام عادل ومعتبر ہیں (صحابۂ رسول: ۱۸۱) علامہ ابن الصلاح عثمان بن عبدالرحمٰن تقی الدین ابوعمرو (متوفی: ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں: تمام صحابہ کرام کی ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت کے بارے میں سوال بھی نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ ایک طئے شدہ مسئلہ ہے قرآن وسنت کی نصوص اور اجماعِ امت جن لوگوں کا معتبر ہے ان کے اجماع سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہو، بعض علماء نے فرمایا: کہ مفسرین حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت اصحابِ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نازل ہوئی ہے (صحابۂ رسول از نورعالم خلیل امینی مدظلہٗ: ۱۸۲)

عدالتِ صحابہؓ کا اور صحابہؓ کا معیارِ حق ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان سے بشری غلطیاں بالکل سرزد نہیں ہوتی ہیں یا ان سے خطاؤں کا قطعاً وقوع نہیں ہوا ہے یہ خاصہ ومنصب تو انبیاءؑ کا ہے، صحابہؓ کا نہیں؛ بلکہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ان سے بشری غلطیاوں کا صدور ہوا ہے مگر جب ان کو تنبیہ ہوا تو فوراً وہ اس سے تائب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کی ضمانت لی ہے، جہاں تک اجتہادی خطاؤں کے صدور کا سوال ہے تو اس کے وقوع سے بھی کسی کو انکار نہیں تاہم پوری امت کا یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے کہ **من حیث المجموع** حق اور صواب صحابہؓ ہی کی جماعت میں منحصر رہا ہے، اب کبھی نہیں ہوا اور نہ ایسا ہونا کبھی ممکن ہی ہے کہ حق پوری جماعتِ صحابہؓ سے اوجھل رہا ہو اور بعد کے لوگوں نے اس کو دریافت کیا ہو یہ گمراہ کن موقف، ان نصوص کے صدق ویقین ہی پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے جن میں مناقبِ صحابہؓ بیان ہوئے ہیں، یہ عندیہ اور یہ امکانِ وہمی، حساً، عقلاً اور شرعاً ہر سہ اعتبار سے لایعنی اور ناقابلِ فہم ہے۔

ومن المحال علی من هذا شانهم ان یخطئوا کلهم الحق ویظفر به المتاخرون ولو کان هذا ممکنا لانقلبت الحقائق وکان المتاخرون آئمة لهم یجب علیهم الرجوع الی فتاویهم وأقوالهم وهذا کما انه محال حساً وعقلا فهو محال شرعاً وباللّٰه التوفیق (اعلام الموقعین: ۴/۱۷۴)

والمحظور انما هو خلو عصرهم عن ناطق بالصواب واشتماله على ناطق بغيره فقط فهذا هو المحال (۴/ ۲۰۱) صحابۂ کرامؓ نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی سے بعض مرتبہ بتقاضائے بشریت دو ایک یا چند غلطیاں سرزد ہوگئی ہوں؛ لیکن تنبیہ کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اللہ نے انہیں معاف فرما دیا، اس لیے وہ ان غلطیوں کی بناء پر فاسق نہیں ہوئے، یہ مفہوم جمہور اہلِ سنت کے نزدیک درست ہے (حضرت معاویہؓ از مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ: ۱۳۰/۱۳۱)

مشاجراتِ صحابہرضی اللہ عنہ صحابہؓ کے درمیان رونما ہوئے باہمی محاربات ونزاعات کے تعلق سے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے کئی ایک اسباب ہیں (الف) مسئلہ کی اہمیت ونزاکت سے صرفِ نظری (ب) تاریخی اور تشریعی روایات میں عدم تمیز (ج) موجودہ سیاسی ماحول پر قیاس۔

الف: مشاجراتِ صحابہ کا مسئلہ اس اعتبار سے بڑا نازک ہے کہ اس معاملہ میں ذراسی بے احتیاطی اور افراط وتفریط کا اثر براہِ راست عدالتِ صحابہؓ پر پڑتا ہے، خطاؤں اور لغزشوں کا بے تاویل بے بنیاد اور بے سوچے سمجھے انتساب عدالتِ صحابہؓ ہی کو مجروح کر کے رکھ دیتا ہے اور بالآخر دین پر ہی سے انسان کے اعتماد کو اُٹھا دیتا ہے حالانکہ سنت اللہ کے مطابق حفاظتِ دین اور شریعتِ مصطفویہ (**علی صاحبها التسليم**) کو ان باخدا انسانوں کی وساطت سے اپنی اصلی شکل پر برقرار رکھنے کا ذمہ خود پروردگارِ عالم نے لیا ہے اس لیے وہ تمام مفروضے جن سے دینِ اسلام کے اس پہلے قافلہ کی پوزیشن مجروح ہوتی ہو از خود باطل قرار پاتے ہیں۔

عدالتِ صحابہ کا مسئلہ خالصۃً عقیدہ کا مسئلہ ہے، فروعی مسئلہ نہیں کہ اس کو اجتہادات کا محور یا معرکۃ الاراء بنایا جائے، شروع ہی سے یہ مسئلہ عقائد کی کتابوں میں جگہ پاتا رہا ہے، عصمتِ انبیاء کے عقیدہ کے بعد عدالتِ صحابہؓ کے عقیدہ کا تذکرہ مؤلفین کتب عقائد کا گویا مشترکہ وطیرہ رہا ہے اس لیے مشاجراتِ صحابہؓ سے متعلقہ تاریخی روایات میں تنقیح وتحقیق کا معیار وہی ہونا چاہیے جو عقائد واحکام سے متعلقہ روایات کا ہے اس معاملہ میں کمزور و بے اصل روایات کو قطعاً درخورِ اعتنا سمجھنا ہی نہیں چاہئے اور قوی روایات کا صحیح محمل تلاش کرنا چاہئے، حضرت مفتی شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: علماء اسلام کی تاکید ہے، عقائد واحکام اور

حلال وحرام کے باب میں تاریخی روایات نا قابلِ احتجاج ہیں، چونکہ مشاجراتِ صحابہؓ کا تعلق عقیدے سے ہے اس لیئے علماء نے کہا: ہے کہ کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے اس کا ثبوت ضروری ہے (مقام صحابہؓ:۲۳، بحوالہ صحابہ رسول:۲۴۸)

تاریخی اور تشریعی روایات میں عدم تمیز: اہلِ علم پر یہ امر مخفی نہیں کہ مقدم الذکر دونوں طرح کی روایات کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے اس فرق کا خود وہ گروہ بھی قائل ہے جو مشاجراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو موضوعِ بحث بناتا ہے تاریخی روایات میں رواۃ کے معاملے میں بڑے توسع اور اغماض سے کام لیا جاتا ہے، بہت سے وہ رواۃ جو تشریعی (عقائد واحکام سے متعلقہ) روایات میں نا قابلِ اعتماد قرار دیئے گئے ہیں فن تاریخ میں ان کو امام تسلیم کیا گیا ہے ایسے ہی بہت سے ائمہ اسلام علم حدیث اور روایاتِ احکام کے میدان میں بڑے ہی محتاط باریک بین اور سخت گیر دکھائی دیتے ہیں، جب کہ علم تاریخ میں ان کے تیور کچھ اور ہی نظر آتے ہیں، یہی ابنِ کثیرؒ جن کا بحث وتحقیق اور جرح ونقد کے حوالے سے بڑا شہرہ ہے البدایۃ والنہایۃ میں ان کی شان کچھ اور ہی نظر آتی ہے، یہ تفریق اور توسع دراصل اس لیئے بھی گوارا کرلیا گیا ہے کہ تاریخی روایات سے کوئی عقائد اور احکام تو ثابت کرنا نہیں، صرف عبرت ونصیحت کا سامان بہم پہنچانا اور تجارب اقوام سے فائدہ حاصل کرنا ہے ظاہر ہے یہ مقصد نسبۃً توسع اور وسعتِ نظری کا متحمل ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مقام صحابہؓ)

غلط فہمی کی بناء پر مشاجراتِ صحابہؓ کے مسئلہ کو خالص تاریخی مسئلہ سمجھ لیا گیا ہے اور تنقیح روایات کے معروف اصولوں کو پس پشت ڈال کر بعض تاریخی روایات کے سہارے خیالات کا ایک شیش محل تعمیر کرلیا گیا ہے، حالانکہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ یہ عقیدہ کا مسئلہ ہے جیسا کہ سابق میں اس کو واضح کیا جاچکا ہے۔

موجودہ سیاسی ماحول پر قیاس: صحابہؓ کے وہ باہمی محاربات جو نا قابلِ تردید روایات سے ثابت ہیں، جیسے جنگِ صفین، جنگِ جمل وغیرہ ان سے عظمتِ صحابہؓ کے معاملہ میں بعض حضرات کو مغالطہ یوں پیدا ہوگیا ہے کہ انہوں نے خیر القرون کو اپنے دور کی سیاست پر قیاس کرلیا ہے، وہ تمام عوامل محرکات جو موجودہ دور کے سیاستدانوں کے درمیان رسہ کشی کا

باعث بن سکتے ہیں، پہلی صدی کی ہستیوں میں بھی باور کرلیا گیا جس کے نتیجے میں دنیاداری، ہوسِ جہانبانی، خوشامدی، قانون شکنی جیسے بھاری بھرکم عوامل کا ان حضرات کی طرف انتساب کرنا پڑا، اس قیاس کے مبنی بر غلط ہونے کے لیے یہی نکتہ بہت کافی دلیل ہے کہ اس مزعومہ کا بالواسطہ نشانہ صحبتِ بافیض بنتی ہے، کیوں کہ دونوں ہی طرف اپنے بہت سے صحابہؓ موجود تھے جو ایک عرصہ تک صحبت باا ثر سے بہرہ ور ہوئے تھے، پھر اس سے مناقبِ صحابہؓ سے متعلقہ نصوص کی صداقت پر بھی حرف آنے لگتا ہے۔

جمہورامت کا موقف: اس سلسلہ میں چند نصوص ملاحظہ ہوں، صحابۂ کرام کا تذکرہ بھلائی ہی کے ساتھ کرنا ضروری ہے جو مشاجرات ان کے مابین رونما ہوئے ان میں بعض تو بالکل بے بنیاد اور بے اصل ہیں اور جن کا واقعی ثبوت ہے تو اس کی عمدہ تاویل وتوجیہہ ہمارا فریضہ ہے؛ کیونکہ کتاب اللہ میں ان کی توصیف ومنقبت، قطعی بھی ہے اور سابق بھی اور بعد کی تاریخی روایات متاخر بھی ہیں اور قابلِ تاویل بلکہ بعض قابلِ رد بھی (شرح فقہ اکبر:۸۶)

حضرت امام شافعیؒ کا فرمان ہے: یہ ایسے خون ہیں، جن سے ہمارے ہاتھوں کے رنگین ہونے کو اللہ نے بچالیا ہے تو اب ہم اپنی زبانوں کو بھی ان سے آلودہ ہونے نہ دیں گے، امام احمدؒ سے حضرت علیؓ وعائشہؓ کی باہمی جنگ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؒ نے جواب میں بس یہ آیت پڑھی، یہ ایک امت تھی جو گذر گئی اس کے لیئے اس کے اعمال تمہارے اعمال تمہارے لیئے ہیں، تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا (البقرہ:۱۴۰) (حوالۂ سابق)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی علیہ الرحمہ ارشاد فرماتے ہیں: اور ان لڑائی جھگڑوں کو جو ان کے درمیان واقع ہوئے ہیں، نیک محمل پر محمول کرنا چاہئے اور ہوا وتعصب سے دور سمجھنا چاہئے کیوں کہ وہ مخالفتیں تاویل واجتہاد پر مبنی تھیں، نہ ہوا وہوس پر، یہی اہل سنت کا مذہب ہے (مکتوباتِ امام ربانی، مکتوب:۲۵۱، دفترِ اول)

یہ اکابر رسول اللہ ﷺ کی صحبت کی تاثیر سے ہوا وہوس کینہ وحرص سے پاک صاف ہوگئے تھے، ان حضرات کے اختلافات کو دوسروں کی مصالحت سے بہتر سمجھنا چاہئے (مکتوب:۶۷ دفتر دوم، نیز ملاحظہ ہو، مفصل ومفید مکتوب:۳۶ /دفتر دوم)

ترجمان القرآن حبر الامّہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

تعارف

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بن عبدالمطلب نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، انکی والدہ امّ الفضل لبابہ بنت الحارث الھلالیہ تھیں، جوامّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کی ہمشیرہ بھی ہوتی تھیں، یہ ان دنوں پیدا ہوئے جب نبی کریم ﷺ اور آپ ؐ کا قبیلہ شعبِ ابی طالب میں محصور تھا، جب پیدا ہوئے تو ان کو آپ ؐ کی خدمت میں لایا گیا، آپ ؐ نے تبرکاً لعابِ مبارک ان کے منھ میں ڈالا، یہ ہجرت سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے، آغازِ طفولیت ہی سے رسول کریم ﷺ سے وابستہ دامن رہے، آپ ؐ کی وفات کے وقت ابن عباسؓ کی عمر امام احمد بن حنبل کی ترجیح کی روشنی میں پندرہ برس تھی وفاتِ نبی کے بعد کبارِ صحابہ کی صحبت اختیار کی اور ان کے چشمۂ علم سے اپنی علمی پیاس بجھائی، قول راجح کے مطابق ۶۸ھ میں بعمر 70 سال طائف میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے، محمد بن حنفیہ نے آپؓ کی نماز جنازہ پڑھائی، قبر میں اتارا اور ان الفاظ میں ان کو خراجِ تحسین پیش کیا، آج اس امت کے عظیم عالم نے وفات پائی (فقہ عبداللہ بن عباسؓ للدکتور محمد روّاس)

وسعتِ علم

حضرت ابن عباسؓ وسعتِ علم کے معاملہ میں بے نظیر تھے، وہ بیک وقت فقہ، تفسیر، علمِ میراث، شعروادب، مغازی وتاریخ عرب پر کامل دسترس رکھتے تھے، ان علوم کے شائقین باری باری حضرت ابن عباسؓ سے استفادہ کیا کرتے تھے، کثیر العلم ہونے کی وجہ سے آپؓ کو الحبر (بڑا عالم) اورالبحر (سمندر) کے القاب سے بھی پکارا جاتا تھا (تہذیب التہذیب ۵/۲۷۶)

علمی برتری کے اسباب

حضرت ابن عباسؓ کی علمی برتری کے کئی ایک اسباب ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق کسب سے ہے اور بعض خالص وہبی ہیں، کسب سے تعلق رکھنے والا بنیادی سبب حضرت ابن

عباسؓ کا وہ علمی شغف تھا جو انہیں کسی پل چین لینے نہ دیتا تھا، اس موقع پر حضرت ابن عباسؓ کی ایام طالب علمی کا یہ واقعہ ناظرین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، ابن عباسؓ فرماتے ہیں : میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ چلو بھائی ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں سے چل کر دریافت کریں کیوں کہ ابھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے لیکن ان کے رفیقِ بخت کے چھوٹے تھے بولے: ابن عباسؓ کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگ بھی تمہارے محتاج ہوں گے حالانکہ ابھی تو لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کے بہت سے صحابہ موجود ہیں، لیکن اس بے چارہ کو کیا معلوم تھا کہ یوں ہی چھوٹے ، بڑوں کے گزرنے کے بعد بڑے بنتے ہیں ، بعد کو اپنے علمی سرمایہ کی بدولت جب ابن عباسؓ مرجعِ انام بن گئے تو وہ بے چارے پچتاتے تھے اور کہتے تھے: **کان ھذا الفتی اعقل منّی**: یہ نوجوان مجھ سے زیادہ دانشمند تھا (مسند دارمی: ۵۸۰)

وہب وعطا سے تعلق رکھنے والا بنیادسبب، رسول اللہ ﷺ کی وہ دعا تھی جس نے حضرت ابن عباسؓ کو علم وحکمت ، فقاہت وتفسیر کے اوجِ ثریّا پر پہنچا دیا تھا، ایک سے زائد بار آپؐ نے حضرت ابن عباسؓ کے لئے حکمت وفقاہت سے بہریاب ہونے کی دعا فرمائی تھی دعا کے الفاظ یہ ہیں:

اۓ اللہ: اسے کتاب کا علم سکھادے (مشکوۃ: ۵۶۹)

ایک روایت کے مطابق: اۓ اللہ اسے حکمت سکھادے (مشکوۃ: ۵۶۹)

ایک روایت کے الفاظ ہیں: اۓ اللہ اسے دین کی فقاہت یعنی سمجھ عطا کر (مشکوۃ: ۵۶۹)

ایک اور روایت میں ارشاد ہے : اۓ اللہ اسے دین کی فقاہت عطا کر اور تاویل یعنی تفسیر کا علم سکھادے (مسند احمد ۱/۲۶۴) خود حضرت ابن عباسؓ بجا طور پر فخر ومباہات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے: میرے لئے اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے دو مرتبہ حکمت کی دعا فرمائی ہے (مشکوۃ: ۵۷۰)

تفسیر میں مقام

تفسیر کے معاملہ میں اکابرین صحابہ، اکثر تابعین، آپؓ سے رجوع ہوا کرتے تھے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ بن خطاب، آپؓ کے جلیل القدر صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے

مشکلاتِ قرآن کے حل کے معاملے میں بارہا آپؓ سے مراجعت کی تھی، باب العلم حضرت علیؓ بن ابی طالب برملا آپؓ کی تفسیری صلاحیت کا اعتراف فرمایا کرتے تھے، حضرت ابن مسعودؓ نے آپؓ کو ترجمان القرآن کا لقب دیا تھا(تاریخ تفسیر و مفسرین:۶۸)

ایک دفعہ ایک نوجوان نے متعدد ایسی قرآنی ایات جو بظاہر ایک دوسرے کے معارض معلوم ہوتی تھیں، حضرت کی خدمت میں رکھ کر اپنے اشکالات کی تشفی چاہی، حضرت ابن عباسؓ نے اسی مجلس میں ان ایات کے باہمی تعارض کو بڑے سلیقہ سے رفع فرمایا اور نوجوان کی تشنگی و اضطراب کو دور کردیا (الموافقات للشاطبی۴/ ۱۴۹) ایک دفعہ ایک شخص کی ذہنی سطح کی پستی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ اگر میں تمہاری پیش کردہ آیت کی تفسیر تمہارے سامنے بیان کروں تو اندیشہ ہے کہ تم اس کا انکار کر بیٹھو گے (اعلام الموقعین۴/۲۰۴)

حدیث میں مقام

حدیث کے باب میں آپؓ کا شمار مکثرین صحابہ کے طبقہ سے ہوتا ہے جنہوں نے بکثرت آنحضرتﷺ کی روایات نقل کی ہیں، آپؓ کی کُل مرویات کی تعداد ۲۶۶۰ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اکابر صحابہ سے بڑی ہی محنت وجستجو سے یہ احادیث جمع کی تھیں خود فرماتے ہیں: مجھے اگر پتہ چلتا کہ فلاں صحابی کے پاس حضورﷺ کی ایک حدیث ہے تو میں ان کے دروازے پر پہنچ جاتا چوں کہ یہ دوپہر کے قیلولہ کا وقت ہوتا اس لئے میں اپنی چادر کو تکیہ بنا کر اس کے سہارے لیٹ جاتا پھر قیلولہ سے فارغ ہوکر مذکورہ صحابی اپنے گھر سے باہر آتے اور مجھ کو دیکھ کر فرماتے: اللہ کے رسولؐ کے ابن عم (چچازاد بھائی) آپؓ نے مجھے پیغام کیوں نہیں بھیج دیا کہ میں خود آپؓ کے پاس آجاتا (تذکرۃ الحفاظ ۱/ ۴۱)

استدلال بالحدیث

حضرت ابن عباسؓ نہ صرف یہ کہ حافظِ حدیث تھے بلکہ اور صحابہ کی طرح بر موقع استدلال بالحدیث بھی کیا کرتے تھے، ایک دفعہ آپؓ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ اگر کوئی شخص قسم کے ساتھ اپنے اوپر وہ چیز حرام کرلے جو اللہ نے اس پر حرام نہیں فرمائی تو اسے قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا یہ کفارۂ یمین ہے، وہ چیز اس پر حرام نہ ہوسکے گی، پھر آپؓ نے یہ آیت تلاوت

فرمائی کہ تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کے عمل میں بہترین نمونہ ہے (احزاب :۲۱) (مسلم شریف : ۳۶۵۵) حضرت ابن عباسؓ و حضرت معاویہؓ خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے، حضرت معاویہؓ نے خانۂ کعبہ کے تمام کونوں کو بوسہ دیا، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ؐ ان دونوں کونوں یعنی رکن یمانی اور حجرِ اسود کے علاوہ کسی اور گوشہ کو بوسہ نہیں دیا کرتے تھے، حضرت امیر معاویہؓ نے فرمایا: اس مقدس گھر کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس کو چھوڑ دیا جائے، حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: تمہارے لئے رسول مقبول ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے، حضرت معاویہؓ نے فرمایا آپؓ کا فرمانا صحیح ہے (مسند احمد ۱/۳۳۲) ان دونوں موقعوں پر گویا آپؓ نے عملِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے حجت کیا، ایک مرتبہ آپؓ نے طاؤسؒ کو دیکھا کہ عصر کے بعد نفل نماز پڑھ رہے ہیں، آپؓ نے ان سے کہا کہ یہ عمل ترک کردو، طاؤسؒ نے کہا کہ یہ عمل ممنوع اس وقت ہے جب کہ سنت کی حیثیت سے اسے اختیار کیا جائے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، مجھے پتہ نہیں کہ آیا تم کو اس نماز پر عذاب ہوگا یا اجر ملے گا پھر آپؓ نے سورۂ احزاب کی آیت: ۳۶ تلاوت فرمائی کہ: کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول ؐ کسی کام کا حکم دیدیں کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول ؐ کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا، (الموافقات ۴/۳۴۲، بیہقی ۲/ ۴۵۳) یہاں حضرت ابن عباسؓ نے قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حجت قائم کی پھر قولِ رسول کے حجت ہونے پر قرآنی آیت سے استشہاد کیا۔

شعر وادب میں مقام

شعر وادب میں بھی ابن عباسؓ کو خاصا درک حاصل تھا، غرائب القرآن کے حل کرنے میں حضرت ابن عباسؓ نے اپنی اس قابلیت کا بھرپور استعمال کیا، ابن عباسؓ کے ادبی ذوق و مہارت اور بے مثال قوتِ حافظہ کے حوالے سے یہ قصہ مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ۸۰ شعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق گفتگو چلی، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مصرعہ اس نے یوں پڑھا تھا، جو مخاطب تھا اس نے

پوچھا کہ تم کو پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا؟ بولے کہو تو پورے ستر شعر سنا دوں اور سنا دیا (الاعلام۴/ ۲۲۵۔تدوینِ حدیث:۴۱)

فقہ واجتہاد

ویسے تو صحابہ کرامؓ کی ایک ممتاز جماعت فقہ وفتاوی کا شغل رکھتی تھی بوقتِ ضرورت نئے مسائل کے پیش آنے کی صورت میں اجتہاد واستنباط، قیاس وتفقہ کے ملکہ کو بھی کام میں لایا کرتے تھے، تاہم حضرت ابن عباسؓ کی شان یہ تھی کہ وہ اس ممتاز جماعت کے بھی اس حصہ سے تعلق رکھتے تھے جو مکثرینِ فتوی کے لقب سے معروف تھا، نہ صرف حضرت ابن عباسؓ خود کے فتاوی صادر کیا کرتے تھے بلکہ وقت پڑنے پر اس معاملہ میں وہ خلفاء راشدین اور عام اربابِ افتاء کی معاونت بھی کیا کرتے تھے، ابن عباسؓ نے اس کثرت سے فتاوی دیئے کہ علامہ ابن حزم کے مطابق خلیفہ مامون الرشید کے پڑپوتے ابوبکر محمد بن موسیٰ نے فتاوی ابن عباسؓ ۲۰ جلدوں میں جمع کئے ہیں (الاحکام فی اصول الاحکام۵/۵۲)

حضرت ابن عباسؓ کی صلاحیتِ اجتہاد کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی لسان الحق شخصیت آپؓ کی رائے وفتوے پر اعتماد کیا کرتی تھی، کبھی کبھار حضرت عمرؓ یوں فرماتے: ہمارے سامنے پیچیدہ مقدمات پیش ہوتے ہیں اور تم ہی انہیں اور ان جیسے دیگر مسائل کو حل کروگے، (اسدالغابہ۳/ ۲۹۱) بعض دفعہ مشورہ طلب کرتے ہوئے فرماتے: غوطہ خور! ذرا غوطہ تو لگاؤ۔ (سیر اعلام النبلاء۳/ ۳۴۶) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ پیچیدہ مسائل پیش آنے پر ابن عباسؓ کو طلب کرتے اور صرف یہ فرماتے کہ ایک پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، حالانکہ امیر المؤمنین کے اردگرد بدری صحابہ موجود ہوتے (طبقات ابن سعد۲/ ۳۶۹) حضرت ابن عباسؓ کی اجتہادی صلاحیت کو اس سے بھی جلا ملی کہ کبارِ صحابہ کے اجتہادات پر بھی انکی گہری نظر تھی، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کا کہنا ہے کہ: حضورﷺ کی احادیث نیز حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عدالتی فیصلوں کا حضرت ابن عباسؓ سے بڑھ کر علم رکھنے والا اور انہیں سمجھنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا (الاستیعاب۳/ ۲۹۱)

غرض کسی مجتہد کے لئے جن علوم میں دسترس ومہارت درکار ہوتی ہے، ان سارے علوم میں حضرت ابن عباسؓ یگانۂ روزگار اور استاذِ زمانہ تھے، مجتہد کی تعریف علمائے حدیث مثلاً بغویؒ، رافعیؒ علامہ نوویؒ وغیرہ نے ان لفظوں میں کی ہے: مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن، حدیث، مذاہبِ سلف، لغت، قیاس، ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو یعنی مسائل شرعیہ کے متعلق جس قدر قرآن میں آیتیں ہیں جو حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں، جس قدر علم لغت درکار ہے، سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طرق ہیں، قریب کُل کے جانتا ہو، اگر ان میں سے کسی میں کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے اور اس کو تقلید کرنی چاہیے (عقد الجید از شاہ ولی اللہؒ ۷)

مجتہد کے یہ معیارات اگر چہ بعد کے وضع کردہ ہیں تاہم اگر انکی روشنی میں بھی ابن عباسؓ کی شخصیت کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ حقیقیت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ پیمانے ابن عباسؓ جیسی شخصیات کے وصفِ اجتہاد کی پیمائش کے مطلق قابل نہیں بلکہ حق بات یہ ہے کہ ابن عباسؓ جیسی شخصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے بعد کے علماء نے نہایت مائل بہ تنزل ہو کر مجتہد کے لئے اخیر درجہ کے طور پر یہ معیارات مقرر کئے ہیں۔ ذیل میں ہم چند نظائر کے ذکر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں جن سے حضرت ابن عباسؓ کی قابلیتِ اجتہاد وقیاس کا اظہار ہوتا ہے۔

آیات قرآنی سے استنباط

حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک شخص آیا کہنے لگا: میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی؟ آپؓ نے فرمایا: تمہارے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی، اس لئے اس نے اس کو شرمسار کر دیا اور شیطان کی فرمانبرداری کی، اس لئے اس نے اس کے لئے کوئی نکلنے کی راہ نہیں چھوڑی، سائل نے اس پر کہا: اگر کوئی شخص اس کی بیوی کا حلالہ کر کے اس کو واپس کر دے تو؟ آپؓ نے فرمایا: جو شخص دھوکہ دیتا ہے اللہ تعالی خود اسے دھوکہ کے برے انجام سے دوچار کر دیتے ہیں (مصنف ابن ابی شیبہ ۵/۱۱)

ایک شخص نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دے دی، آپؓ نے فرمایا: تین طلاق تم پر اسے حرام کر دے گی اور باقی طلاقیں تم پر بوجھ رہیں گی، تم نے تو اللہ کی آیات کو مذاق بنالیا ہے، (مصنف عبدالرزاق ۶/ ۳۹۸۔ بیہقی ۷/ ۳۳۷)

اس موقع پر حضرت ابن عباسؓ نے اپنے فتوی پر سورۂ طلاق کی ابتدائی دو آیات سے دلیل قائم کی ، ان آیات میں اشارۃً بتدریج سنبھل سنبھل کر طلاق دینے کی تعلیم نکلتی ہے ، دوسری آیات کے ختم پر ایسے محتاط آدمی کے بارے میں ارشاد ہے: جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے رہائی کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال دیتے ہیں ، حضرت ابن عباسؓ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی پھر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے گویا ہوئے: تو اللہ سے ڈرا نہیں ، اس لئے تیری لئے اب کسی قسم کی گنجائش باقی نہیں (موافقات للشاطبی ۱/ ۵۳۵)

ایک موقع پر حضرت علیؓ نے حضرت ابن عباس ؓ کو سفارت کار بنا کر خوارج کے یہاں روانہ کیا تھا، خوارج نے بڑی نرالی ہی چال چلی ، حضرت ابن عباسؓ کی ثالثی کو مغالطہ خیز طور پر آیتِ قرآنی، إن الحكم الاّ للہ ،حکم خدا ہی کا ہے (یوسف:۴۰) کے ذریعہ چیلنج کیا،اس قرآنی ارشاد کے مطابق حکم وثالث خدا ہی ہوسکتا ہے، انسان کا یہ منصب نہیں ،حضرت ابن عباسؓ نے نہایت حاضر دماغی سے ان کی چال انہی پر اُلٹ دی ،فوراًان آیات کا حوالہ دیا جہاں میاں بیوی کے باہمی نزاع کو چکانے کے لئے خود حق تعالی نے حکم اور فیصل تجویز کرنے کا حکم دیا (سورۂ نساء:۳۵) ایسے ہی بروقت ان آیات کی تلاوت فرمائی جہاں شکارِ حرم یا شکار بحالتِ احرام میں جزا کی تعیین حکم حضرات کے سپرد رکھی گئی ہے (مائدہ:۹۵) پھر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ان برخود غلط خوارج سے کہا: کیا امتِ مسلمہ کا باہمی نزاع ، زوجین کے نزاع سے بھی غیر اہم ہے؟ کیا امتِ مسلمہ کا خون صید حرم سے ارزاں ہے؟ حضرت ابن عباسؓ کی اس مدلل وکامیاب سفارت سے تقریباًایک چوتھائی لوگ بغاوت سے تائب ہوئے (اعلام الموقعین لابن قیم :۱/۲۳۴۔۲۳۶)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حیرت انگیز طور پر چاشت کی نماز کا ثبوت قرآن سے پیش کیا: فرماتے تھے یہ نماز قرآن میں ہے لیکن غواص ہی اس میں غوطہ لگا سکتا ہے اور پھر آپؓ نے سورۂ نور کی آیت ۳۶ تلاوت فرمائی۔(مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۱۰۹)

احادیثِ رسولؐ سے استنباط

آپؓ نے حضورﷺ سے یہ روایت کی ہے کہ جو شخص کوئی طعام خریدے تو جب تک اسے اپنے قبضہ میں نہ لے لے، اس وقت تک اسے آگے فروخت نہ کرے، یہ روایت بیان

کرنے کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے اپنا اجتہاد بیان فرمایا کہ میں ہر چیز کو طعام کے بمنزلہ قرار دیتا ہوں (مسلم شریف: ۳۸۱۰) حضرت ابن عباسؓ نے یہ روایت نقل کی کہ آنحضرت ﷺ کا نکاح حضرت میمونہؓ کے ساتھ حالتِ احرام میں ہوا تھا البتہ تعلقاتِ زن وشو بعد از فراغتِ احرام قائم ہوئے تھے (بخاری کتاب الحج: باب تزویج المحرم) اس روایت سے حضرت ابن عباسؓ نے بحالتِ احرام نکاح وانکاح (خود نکاح کرنا اور کسی کا نکاح کرانا) کے جواز کا عمومی فتوی صادر فرمایا تھا، اس بابت حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے: محرم اگر شادی کرلے تو اس میں کوئی حرج نہیں (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۱۶۴)

مجتہد اور قیاس

مجتہد کے لئے قیاس کے بغیر چارہ کار نہیں، بہت سے لوگ قیاس کا نام سن کر بھڑک اٹھتے ہیں اور غلط فہمی کی بنا پر قیاس سے ثابت شدہ احکام ومسائل کو ایک متوازی شریعت خیال کرتے ہیں، حالانکہ دو باہم مماثل مواقع کو حکم میں یکساں رکھنا یا مشترک علت کی بنا پر فرع کو اصل پر قیاس کرنا عین تقاضائے فطرت ہے، حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو مسائل و مقدمات کے فیصل کرنے کے لئے جو ہدایت نامہ لکھ بھیجا تھا اس میں بعینہ قیاس کے اسی طریق کی بالتفصیل تلقین موجود ہے (ازالۃ الخفاء ۲/۱۸۷)

میراث کے معاملہ میں حضرت زید بن ثابتؓ نے جب قیاس کے معروف ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میت کے دادا کو بمنزلۂ ایک بھائی کے قرار دیا تو حضرت ابن عباسؓ نے سخت نکیر فرمائی تھی اور کہا تھا: کیا زید اللہ سے ڈرتے نہیں کہ پوتے کو (بیٹے کی عدم موجودگی میں) بیٹے کے درجہ میں رکھتے ہیں اور دادا کو (باپ کی عدم موجودگی میں) بمنزلۂ باپ نہیں رکھتے (اعلام الموقعین ۱/۲۳۶)

اجتہادی مسائل میں اختلافِ آراء ناگزیر:

غیر منصوص مسائل میں جب کئی ایک مجتہدین اپنی اپنی اجتہادی قوی صرف کریں گے تو ظاہر ہے اختلاف آراء ناگزیر ہے، ذہنی صلاحیتوں کا فطری اختلاف، نظریاتی اختلافات کی شکل میں ظہور پذیر ہوگا، اختلافِ آراء کو انسانوں کا وہی گروہ معیوب سمجھتا ہے، جس کے

افراد جمود و تعطل کا شکار ہو چکے ہوں ، ورنہ ایک صحتمند معاشرے میں ایسا اختلاف ، انسانیت کے لئے جزوِلا ینفک ہے ، البتہ ضرورت ایسی صورتحال کے تحمل کی اور باہمی جذبۂ احترام کی ہے ، موجودہ ماحول میں ایک طبقہ یا تو لفظِ اختلاف ہی سے بدکنے لگتا ہے یا ایک طبقہ اختلاف کے حدود کو پھلانگ کر افتراق و پھوٹ کی راہ پر آ جاتا ہے ، دورِ صحابہ میں ایک طرف اختلافِ آراء بھی آزادانہ طور ہوا کرتا تھا اور دوسری طرف ایک دوسرے کے علمی مرتبہ کا پاس ولحاظ ، ادب واحترام بھی رکھا جاتا تھا ، صحابہ کے مابین ، شوہر کے اس جملہ ''انت علیّ حرامٌ ''تو (یعنی میری بیوی) مجھ پر حرام ہے ، کے حکم کے تعلق سے اختلافِ رائے پایا جاتا تھا ، شیخین (حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ) اسے یمین وقسم قرار دیتے تھے یہی حضرت ابن عباسؓ کی بھی رائے تھی ، حضرت علیؓ و زیدؓ طلاقِ ثلاث (تین طلاق) مانتے تھے اور حضرت ابن مسعودؓ ایک طلاق ہونے کے قائل تھے (اعلام الموقعین ۱/ ۲۳۸) علامہ ابن قیمؒ نے اپنی اس عظیم المرتبت تصنیف میں ایک دوسری جگہ بالتفصیل لکھا ہے کہ اس ایک مسئلہ میں سلف کے تقریباً پندرہ مسلک تھے (اعلام الموقعین ۳/ ۸۵ـ۹۰) لیکن کیا مجال کہ یہ اختلاف ، ان کے درمیان خونریزی یا جدال کا باعث بنتا۔

آنحضرت ﷺ کے نمازِ وتر کے معمول میں اختلاف کی بنا پر نمازِ وتر کی تعدادِ رکعات کے بارے میں صحابہ کے درمیان بھی ایک گونہ اختلاف رائے موجود تھا لیکن اس کے باوجود ، ہر ایک دوسرے کی تصویب کرتا اور اس کے اجتہاد کو بنظرِ استحسان دیکھتا ، حضرت ابن عباسؓ کے غلام کریبؒ نے حضرت معاویہؓ کو دیکھا کہ انہوں نے عشاء کی نماز کے بعد ایک رکعت وتر پڑھی اور اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا ، کریبؒ نے یہ بات حضرت ابن عباسؓ سے بیان کی آپؓ نے فرمایا: بیٹے انہوں نے ٹھیک کیا (بیہقی ۳/ ۲۶ـ۲۷)

مجتہد کا ایک دقیق طرزِ اجتہاد

مجتہد کا ایک طرزِ عمل یہ بھی کوتاہ بینوں کے لئے کھٹک کا باعث بنتا ہے کہ ایک طرف کسی مسئلہ میں بظاہر صریح حدیث موجود رہتی ہے پھر بھی مجتہد کسی ظاہری وجہ کے بغیر اس سے صرفِ نظر کرتا ہے اور بظاہر اس حدیث کے خلاف رائے کو اختیار کرتا ہے ایسے مواقع پر مشتعل

ہوکر مجتہد کو مطعون کرنے کے بجائے مجتہد کے مدارکِ اجتہاد کو بدقتِ نظر ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایسی جگہوں پر عموماً شریعت کے ایسے اصولِ عامہ اور نصوص قاطعہ مجتہد کے پیش نظر رہتے ہیں کہ جن پر محض ایک جزوی دلیل کو فوقیت دینا، وہ اپنے اجتہاد کی رو سے نا درست سمجھتا ہے بلکہ اس کی دانست میں یہ اصولِ عامہ، دلیل مخالف کی ظنیت کے پہلو کو قوی اور اس کے حدّ اعتبار کو گھٹا دیتے ہیں، کوئی شخص تحمل وکشادہ ذہنی سے مجتہد کے اس طرزِ اجتہاد کا جائزہ لے تو اسکے سامنے منطقی اعتبار سے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، یا تو مجتہد کا مصیب ومنی برحق ہونا عیاں ہوجاتا ہے یا مخطی وخطاوار ہونا سمجھ میں آتا ہے، شرافت ودیانت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آدمی پہلی صورت میں مجتہد کی رائے بجان ودل قبول کرلے اور دوسری صورت میں مجتہد کو اپنے اجتہاد میں معذور سمجھے، خواہ مخواہ اپنے زعم میں اس پر مخالفتِ حدیث کا الزام نہ دھرے کہ یہ غیر شریفانہ وغیر عالمانہ عمل ہے۔

عام قارئین کے لئے یہ انکشاف موجبِ حیرت ہوگا کہ اجتہاد کا یہ طرز عمل کوئی نیا نہیں، صحابہ ہی سے چلا آرہا ہے، حضرت عائشہؓ نے اجتہاد کے اس خاص طریقہ کے زیر اثر پسماندگانِ میت کے گریہ وماتم کی وجہ سے میت کے مبتلائے عذاب ہونے کا مضمون بیان کرنے والی حدیث کو قبول نہیں کیا تھا، حضرت عائشہؓ اس خصوص میں نص قطعی ’’ ولا تزر وازرۃ وّزر اخری ‘‘اور بوجھ نہ اُٹھائیگا ایک شخص دوسرے کا (انعام:۱۶۴) مقدم رکھتی تھیں ،انکے نزدیک عذاب وعقاب کا یہ عام اصول معارض روایت کے پایۂ ثبوت پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے ایسے ہی حضرت عائشہؓ نے سورۂ انعام کی آیت ۱۰۳ ’’نہیں پاسکتیں اس کو آنکھیں اور وہ پاسکتا ہے آنکھوں کو‘‘ کی بناپر معراج کی رات جناب رسول اللہ ﷺ کو دیدارِ خداوندی کے ہونے کو بیان کرنے والی روایت کو قبول نہیں کیا تھا (الموافقات ۱۹۲/۳) حضرت ابن عباسؓ نے بھی اسی خاص نہج کے زیر اثر حضرت ابو ہریرہؓ کی ان دو روایات کو قبول نہیں کیا تھا (الف) نیند سے بیدار ہونے والا شخص برتن میں اپنا ہاتھ ڈبونے سے قبل ہاتھ کو برتن کے باہر ضرور ہی دھولے، روایت کا عموم اس کو مقتضی ہے کہ، خواہ ہاتھ پر ناپاکی کا اثر موجود ہو یا نہ ہو ، برتن خواہ چھوٹا اُٹھانے جھکانے کے قابل ہو یا بڑا حوض جیسا ہو، ہاتھ دھونا بہر حال ضروری

ہے۔(ب) آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو لازم ہوگا خواہ یہ پنیر کا ایک بڑا ٹکڑا کیوں نہ ہو، حضرت ابن عباسؓ نے پہلی روایت کو رفعِ حرج کی عام نصوص کے معارض ہونے کے وجہ سے قابلِ اخذ نہیں سمجھا اور دوسری روایت کو آگ کے خلقی خاصہ سے ہم آہنگ نہ ہونے کی بنا پر اختیار نہیں کیا (الموافقات ۳/۱۹۲)

چنانچہ ایک دفعہ فرمایا: آگ تو اللہ کی نازل کردہ برکت ہے یہ کسی چیز کو نہ حلال کرتی ہے اور نہ ہی حرام آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو لازم نہیں ہوتا (مصنف عبدالرزاق ۱/ ۱۶۸۔ کنز العمال ۹/۴۹۳)

قارئین کرام! یہ حضرات عبداللہ ابن عباسؓ کی ہمہ گیر و جامع الکمالات شخصیت کی علمی زندگی کے چند نمونہ وخاکے ہیں، جو نہ صرف اجمالی طور پر حضرتؓ کی شخصیت کے تعارف میں معاون ثابت ہوں گے بلکہ مجتہدینِ امت کے تعلق سے پائی جانے والی عام غلط فہمیوں کے ازالہ کا بھی باعث بنیں گے۔

امام الفقہاء حضرت معاذ بن جبلؓ

حضرت معاذ بن جبلؓ انصاری کا شمار خیر البشر کے ان عظیم المرتبت جاں نثاروں میں ہوتا ہے جو ایک طرف تو راہ حق کے ایک پر جوش مجاہد اور گونا گوں محاسن اخلاق کا پیکر جمیل تھے تو دوسری طرف علم وفضل کا ایسا مجمع البحرین تھے کہ ایک دنیا ان کے فیوض علمی سے بہرہ ور ہوتی تھی اور ان کو عالم ربانی کنز العلماء اور امام الفقہاء کے القاب سے یاد کرتی تھی (الاصابۃ فی معرفۃ الصحابہ)

حضرت معاذ بن جبلؓ کا تعلق انصار کے قبیلے خزرج سے تھا اور وہ اس کی ایک شاخ ادی بن سعد کے چشم و چراغ تھے (الاستیعاب ۴۰۳/۳) نبوت کے بارہویں سال مدینہ میں اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو حضرت معاذؓ نے اس کے قبول کرنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کیا، داعیٔ اسلام حضرت مصعب بن عمیرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صدقِ دل سے توحید کا اقرار کیا، اس وقت ان کا سن کم وبیش ۱۸ سال تھا، قبولیتِ اسلام کے بعد اشاعتِ اسلام کے لئے تن من دھن کی بازی لگادی، بیعتِ عقبہ کبریٰ اور غزوۂ بدر سے لے کر تبوک کے سارے معرکوں میں شریک رہے، مجلس نبوی کے ہمہ وقتی حاضر باش حضرات میں ان کا شمار ہوتا تھا،

مزاج میں جزورسی، معاملہ فہمی اور حق شناسی بلا کی تھی، اپنی علمی پیاس بجھانے اور اپنے ذوقِ تحقیق کی تسکین کے لئے ہمیشہ مناسب مواقع کی تلاش میں رہتے تھے، بسا اوقات خود نبی کریم ﷺ ان کے اس مزاج کی رعایت فرماتے اور انہیں مخاطب بنا کر اپنے فرموداتِ عالیہ سے نہال فرما دیتے، اس طرح نہایت کم عمری ہی میں حضرت معاذؓ نے علومِ نبوت سے اپنے دامنِ مراد کو بھر لیا تھا اور اپنے ہم عصروں میں بڑے ہی قابل رشک بن گئے تھے، ۹ھ میں رسول اللہ ﷺ کے نائب بنا کر یمن بھیجے گئے، وہاں قاضی اور معلم کی حیثیت سے دو سال تک یمن کے باشندوں کو اپنی خدمات سے مستفید کرتے رہے اور ۱۱ھ میں خود اپنی مرضی سے سبکدوش ہو کر مدینہ واپس آگئے، سرورِ دو عالم ﷺ کا وصال ہو چکا تھا اور عہدِ صدیقی چل

رہا تھا، حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اس عظیم مبلغِ اسلام کا نہایت پاس ولحاظ فرمایا، چند دن قیام کر کے حضرت معاذ ؓ نے ملک شام کا قصد کیا اور اپنے اہل وعیال کو لے کر وہیں سکونت پذیر ہوگئے، حضرت ابوبکر ؓ نے انتقال کیا تو حضرت عمر ؓ خلیفہ ہوئے، فتوحاتِ اسلامی کا سیلاب بلادِ شام سے گذر رہا تھا، حضرت معاذ ؓ بھی فوج میں شامل تھے اور میدانوں میں دادِ شجاعت دیتے تھے،

اسی اثناء میں ۱۸ ھ میں نہایت زور وشور سے شام میں طاعون نمودار ہوا، جو طاعونِ عمواس کے نام سے مشہور ہے، یہ طاعون اس قدر شدید تھا کہ بشمول اکابر صحابہ ۲۶ ہزار صحابہ اس میں جاں بحق ہوئے، حضرت معاذ ؓ کی قسمت میں بھی یہ سعادت آئی اور وہ بھی اس وبا میں مبتلا ہوکر بڑے ہی صبر واحتساب کے ساتھ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردیئے، وفات کے وقت ان کی عمر علی اختلاف الاقوال ۳۳ یا ۳۶ یا ۳۸ سال تھی، سن وفات ۱۸ ھ ہے، شام کے مبارک خطہ ہی میں مدفون ہوئے،

حضرت معاذ ؓ کا شمار درسگاہِ نبوی کے ان ہونہار طالب علموں میں ہوتا ہے، جنہیں وہاں عالمِ انسانی کے معلمِ کامل ﷺ کی جانب سے قرآن وحدیث اور فقہ تینوں علوم عالیہ میں خصوصی سندِ فضیلت عنایت کی گئی تھی اور اونچے درجہ کے اہلِ علم صحابہ ان کی جلالتِ شان اور علمی تفوق کے قائل ومداح تھے،

قرآن

قرآنیات میں کمال کا عالم یہ تھا کہ خود حاملِ قرآن ﷺ نے اپنے اصحاب کو ان سے قرآن سیکھنے کا حکم فرمایا، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: چار لوگوں سے قرآن حاصل کرو ابی بن کعب ؓ سے ؛ معاذ بن جبل ؓ سے ؛ سالم مولی ابو حذیفہ ؓ سے ؛ اور عبداللہ بن مسعود ؓ سے (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۱/۱۷۰)

عہدِ رسالت میں جمع وحفظ قرآن کی سعادت جن چار حضرات کے حصہ میں آئی تھی، ان میں سے ایک حضرت معاذ ؓ بھی تھے (ابن عساکر وابوعوانہ بحوالہ حیاۃ الصحابہ عربی ۱/۴۱۷)

اہل یمن کی جانب جن مقاصد کے لئے انہیں مبعوث کیا گیا تھا، ان میں سے ایک اہم

اور بنیادی مقصد وہاں کے باشندوں کو تعلیمِ قرآن سے آراستہ کرنا بھی تھا(الاستیعاب ۴۳۹/۱؛ ۲۴۰)

یمن کے دوسالہ مدتِ قیام میں وہاں کے بہت سارے لوگوں نے قرآنیات میں ان سے کسبِ فیض کیا، ابوتمیم جیشانیؒ کہتے ہیں: میں نے حضرت معاذؓ سے قرآن اس زمانے میں سیکھا جس وقت وہ یمن تشریف لائے تھے (الاستیعاب۱۴/۲) ناشرہ بن سمیؒ بھی اسی زمانے کے شاگرد رہے ہیں اور انہوں نے حضرت معاذؓ کے ساتھ رہ رہ کر قرآن حاصل کیا تھا(الاصابہ۲۰۷/۲)

حدیث

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اگرچہ صحابہ کرامؓ کو روایت حدیث کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی کہ خود حاملِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سامنے تھے، تاہم اس زمانے میں بھی متعدد صحابہ نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں لیکن چوں کہ حضرت معاذؓ احادیث کی روایت میں بہت محتاط تھے پھر آنحضرت ﷺ کے اخیر زمانے سے لے کر اپنی وفات تک بڑے بڑے کاموں کے انجام دینے کے لئے برابر مدینہ سے باہر رہے، اس لئے بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ ''حدیث او چنداں باقی نماند'' کہ ان کی احادیث زیادہ باقی نہ رہیں تاہم روایت حدیث کا سلسلہ اخیر سانس تک جاری تھا، عمواس کے طاعون میں جب انگلی کی سوزش ان کو بسترِ مرگ پر تڑپا رہی تھی ، زبانِ مبارک اس فرض کی ادائیگی میں مصروف تھی ، چنانچہ وفات کے وقت حضرت جابر بن عبداللہؓ اور کچھ لوگ پاس بیٹھے تھے، وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا پردہ اٹھاؤ !میں حدیث بیان کروں گا، جس کو میں نے اب تک اس لئے محفوظ رکھا تھا کہ لوگ تکیہ کر کے بیٹھیں گے، اس کے بعد ایک حدیث بیان کی، حضرت معاذؓ کی احادیث اگرچہ اور صحابہ سے کم ہیں تاہم ان کا شمار راویانِ حدیث کے تیسرے طبقہ میں ہے، ان کی احادیث کی مجموعی تعداد (۱۵۷) ہے، جس میں دو حدیثوں پر بخاری اور مسلم کا اتفاق ہے، تلامذۂ حدیث کی تعداد کثیر تھی ، اکابر صحابہ کا ایک بڑا طبقہ ان سے حدیث کی روایت کرتا ہے، اجلہ تابعین کی ایک جماعت ان کے تلامذۂ خاص میں داخل تھی (سیر الصحابہ ۱۵۶/۵)

فقہ

یہ ایسا موضوع ہے جس سے حضرت معاذؓ کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے‘ مسائل منصوصہ کے بیان وتشریح اور نوازل (نئے پیش آمدہ مسائل) میں اجتہاد و استنباط دونوں پر انہیں یکساں قدرت حاصل تھی‘ جس وقت انہیں یمن کی جانب روانہ کیا جارہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ازراہِ امتحان ان سے دریافت کیا کہ جب کوئی مسئلہ وقضیہ درپیش ہو تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا: کہ کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا، ارشاد فرمایا کہ اگر اس میں اس کا جواب نہ ملے تو؟ عرض کیا کہ سنت رسول اللہ ﷺ کی مدد سے، ارشاد فرمایا کہ اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟ عرض کیا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی کسر نہ چھوڑوں گا! یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرطِ مسرت سے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور اپنے منشاء وچاہت کے مطابق اس باتوفیق قاصد کے پورے اترنے پر خدا کی حمد وستائش فرمائی (اعلام الموقعین ۱/۲۲۱) پھر رسول اللہ ﷺ نے صرف اسی داد وتحسین پر بس نہیں فرمایا بلکہ باقاعدہ ایک نامہ مبارک، اہل یمن کے نام تحریر کروایا، جس میں یہ مضمون تھا کہ میں تمہارے پاس اپنے لوگوں میں سے بہتر ترین شخص کو روانہ کررہا ہوں (الاصابہ ۳/۹۹)

حضرت معاذؓ نے فصلِ قضایا اور حلِ مسائل کا جو طریقہ کار بیان فرمایا، بعد کے تمام مجتہدین کے لئے وہی راہِ عمل قرار پایا اور تقریرِ نبوی سے اس طریقہ کار کا حجت اور برحق ہونا ثابت ہوا۔

فقہ کے میدان میں حضرت معاذؓ کی بلندیٔ شان کے لئے تنہا یہی چیز کافی ہے کہ لسانِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں **اعلمھم بالحلال والحرام** حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم کا خطاب ملا تھا (الاستیعاب ۱/۲۴۰) حضرت معاذؓ نے بہت کم عمر پائی تھی مگر ان کے فتاوی اس کثرت سے موجود ہیں کہ حضرت انسؓ ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابوہریرۃؓ، حضرت ابوموسی اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ جیسے طویل عمر پانے والے اصحابِ افتاء کے فتاوی کی تعداد کو پہنچ جاتے ہیں، علماء نے انہیں صحابہ کے طبقہ متوسطین اربابِ افتاء سے شمار کیا ہے (اعلام الموقعین ۱/۱۳)

حضرت معاذؓ کی شانِ افتاء کا حال یہ تھا کہ خود مدینہ منورہ میں، رسالت مآب ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں لوگوں کو فتوی دیا کرتے تھے (حیات الصحابہ ۱/۴۸۰)

طبقہ صحابہ کے وہ حضرات جو تمام صحابہ کے علوم کا خلاصہ سمجھے جاتے تھے، وہ بھی برملا حضرت معاذؓ کے علم وتفقہ کا اعتراف کرتے تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے: معاذؓ جیسا شخص پیدا کرنے سے عورتیں عاجز ہیں، اگر معاذؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہوجاتا (الاصابۃ ۳/۹۹)

عہدِ صدیقی میں جب حضرت معاذؓ مدینہ خیرآباد کہہ کر ملکِ شام تشریف لے گئے تو حضرت عمرؓ کا تاثر یہ تھا کہ ان کے اس طرح مدینہ چھوڑ چلے جانے سے یہاں کے رہنے بسنے والوں کا فقہ وفتاوی کے باب میں بڑا حرج اور خلل ہوگیا ہے اور میں نے لوگوں کی ضرورت کے خیال سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کو روکنے کے سلسلہ میں گفتگو بھی کی تھی (حیاۃ الصحابہ ۱/۴۸۰) حضرت عمرؓ ہی کا یہ عمومی اعلان تھا کہ جسے فقہ مطلوب ہو وہ حضرت معاذؓ کا رخ کرے (الطبقات الکبری ۲/۳۴۸)

فقیہ الامت، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ؛ حضرت معاذؓ کو ان کی اطاعت شعاری، پیشوائی اور تعلیمِ خیر کی خصوصیت کی بناء پر ''قانت'' اور ''پوری امت کے بجائے'' قرار دیتے تھے، یہ القاب کلام الٰہی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے استعمال ہوئے ہیں (الاستیعاب ۱/۴۱) حضرت معاذؓ کی چند سالہ یمن وشام کی مدتِ قیام میں، ان کے بعض ایسے شاگرد تیار ہوئے، جو آگے چل کر اپنے پورے علاقہ کے مرجع الفقہاء بنے: حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؒ جو حضرت معاذؓ کے ہمدم شاگرد اور صاحبِ معاذؓ کے لقب سے معروف تھے، وہ اہل شام کے فقیہ ترین علماء میں شمار ہوتے ہیں اور شام کے اکثر تابعین نے انہیں سے فقہ حاصل کی تھی (الاستیعاب ۱/۲۵۷) عمرو بن میمونؒ جن کا شمار کوفہ کے بڑے فقہاء میں ہوتا تھا انھوں نے بھی حضرت معاذؓ سے کسبِ فیض کیا تھا پھر حضرت معاذؓ ہی کے مشورے سے ان کی وفات کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فقہ کی تکمیل کی تھی (اعلام الموقعین ۱/۲۶)

حضرت معاذؓ کے ملکۂ استنباط اور کمالِ فقہ کا اندازہ ان مسائل سے لگایا جاسکتا ہے، جن کی بنیاد اپنی رائے سے حضرت معاذؓ نے ڈالی اور پھر رسالت مآب ﷺ نے ان کی

تصویب فرمائی، مثلاً شروع زمانے میں جو لوگ جماعت میں دیر سے پہنچتے اور ان کی کچھ رکعتیں چھوٹ جاتیں تو وہ نمازیوں سے اشارے سے پوچھتے کہ کتنی رکعتیں ہوئیں اور وہ اشارے سے جواب دیدیتے، اس طرح لوگ فوت شدہ رکعتیں پوری کر کے صف نماز میں مل جاتے تھے، ایک دن جماعت ہورہی تھی اور لوگ قعدہ میں تھے کہ حضرت معاذؓ آئے اور دستور کے برخلاف فوت شدہ رکعتیں پڑھے بغیر، جماعت کے ساتھ قعدہ میں شریک ہوگئے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: معاذؓ نے تمہارے لئے ایک طریقہ نکالا ہے تم بھی ایسا ہی کیا کرو (کشف الاسرار ۳/۴۱۶)

رسول اللہ ﷺ کے حین حیات، حضرت معاذؓ نے ملک یمن میں وراثت کا ایک مسئلہ یوں حل فرمایا تھا کہ میت کے دو ورثاء؛ بیٹی اور بہن میں سے ہر ایک کو نصف کا حقدار قرار دیا تھا ،حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا خیال یہ تھا کہ میت کے ورثاء میں بیٹی اور بہن جمع ہونے کی صورت میں حقدار صرف بیٹی ہے اور بہن ترکہ سے محروم رہے گی مگر جب ان کو حضرت معاذؓ کے اس ناقابلِ تردید فتوی کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا (احکام القران کیاھراسی ۳/۶۶) طاؤسؒ کہتے ہیں کہ حضرت معاذؓ؛ زمانۂ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کے دور میں، تہائی چوتھائی پیداوار پر زمین کو بٹائی پر دیا کرتے تھے اور آج تک اس پر عمل جارہی ہے (المجموع شرح المہذب ۱۴/۴۰۰)

جماع کی ایک خاص صورت (مباشرت بلاانزال) میں صحابہ کرامؓ میں اختلاف تھا ،بعض اس کی وجہ سے غسل کے واجب ہونے کے قائل تھے، جب کہ بعض غسل کو غیر ضروری قرار دیتے تھے، حضرت معاذؓ اور حضرت علیؓ کا اصرار پہلی رائے پر تھا، حضرتِ عمرؓ اس صورتِ حال سے نہایت متردد تھے، بالآخر اس مسئلہ میں حضرت عائشہؓ سے رجوع کیا گیا تھا تو حضرت عائشہؓ نے حضرت معاذؓ کی رائے سے اتفاق کیا اور اس پر حضرت عمرؓ اور تمام صحابہؓ کا اجماع ہوگیا (مسند احمد ۵/۱۱۵)

وراثت کے باب میں عام صحابہ، دین کے اختلاف کو مانعِ ارث ٹھہراتے تھے (بعد کو ائمہ اربعہ نے بھی یہی رائے اختیار کی) ان حضرات کے پیشِ نظر، یہ ارشادِ نبوی تھا کہ نہ مسلمان کو

کافر کی میراث ملتی ہے اور نہ کافر کو مسلمان کی (رواہ الجماعۃ الا النسائی : نیل الاوطار ۶/۴۳) حضرت معاذؓ وحضرت معاویہؓ کا نظریہ تھا کہ مسلمان کو غیر مسلم کی میراث ملے گی ،ان دونوں بزرگوں نے اس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط کیا تھا، کہ اسلام غالب رہتا ہے مغلوب اور نیچا نہیں ہوتا (احکام القران للجصاص ۲/۱۲۷- الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/۷۷۱۹)

حضرت سعید بن مسیّبؒ سے مروی ہے: حضرت عمرؓ نے یہ تحریر جاری کرائی تھی کہ عشاء کا اول وقت شفق کے غائب ہونے پر شروع ہوتا ہے اور حضرت معاذؓ کا فرمان تھا کہ شفق سے مراد؛ افق کی سفیدی ہے (احکام القران للجصاص ۲/۳۴۳)

تقسیم زکوۃ میں حضرت معاذؓ تمام اصناف مستحقین کو دینا ضروری خیال نہ کرتے تھے ، بلکہ ان کا معمول یمن میں یہ تھا کہ کسی ایک صنف کو زکوۃ دے دیا کرتے تھے (احکام القران للجصاص ۳/۱۷۹)

نماز جمعہ کے بارے میں ،حضرت معاذؓ کی رائے یہ تھی کہ امام کے سلام پھیرنے سے قبل جو شخص بھی نماز میں شامل ہو جائے اس کو جمعہ مل گیا (احکام القران للجصاص ۳/۵۹۷)

اسلام نے عدل وانصاف کی رعایت کے ساتھ تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے، مگر علم وتقوی کے بغیر یہ رعایت ممکن نہیں ،حضرت معاذؓ عالم وفقیہ بھی تھے اور متقی و پارسا بھی ،اس لئے انہوں نے اس حوالے سے بھی پوری امت کے سامنے ایک نہایت مثالی نمونہ پیش فرمایا ہے، صورتحال یہ تھی کہ ایک بیوی کی باری میں دوسری بیوی کے یہاں نہ وضو کیا کرتے تھے نہ پانی کا گھونٹ پیتے تھے، حد یہ کہ طاعون عمواس میں جب دونوں بیویاں داغ مفارقت دے گئیں اوران کی تدفین کا مرحلہ آیا تو قرعہ اندازی کی پھر اس کے مطابق ایک کو پہلے اتارا پھر دوسری کو (حیاۃ الصحابہ ۳/۴۸۷)

الغرض حضرت معاذؓ کی یہ علمی وعملی زندگی ہمارے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی روشنی میں ہم اپنے علم وعمل کے زاویوں کو درست کر سکتے ہیں اور فہم و کردار کے بگاڑ کو دور کر سکتے ہیں!

قیاس — حقیقت وضرورت

قیاس فقہ اسلامی کی ایک اصل ہے، جس کی افادیت واہمیت جمہور امت، ائمہ اربعہ ان کے متبعین، امام ابن تیمیہؒ اوران کے شاگرد رشید علامہ ابن القیمؒ تمام ہی کے نزدیک مسلم ہے، کیوں کہ اسلام ایک زندہ وجاوید مذہب ہے، جس میں جمود وتعطل کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے۔ اِدھر زندگی میں نت نئے مسائل جب بھی سامنے آتے ہیں تو چوں کہ نصوص محدود ہیں، وہ براہِ راست زندگی کے سارے مسائل کا احاطہ نہیں کرسکتے، اس لئے قیاس کو اختیار کرنا اسلام کی ابدیت اوراس کے حرکیاتی پہلو کے پیش نظر ضروری ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقاء لکھتے ہیں کہ جزئیات وتفاصیل کے باب میں کتاب وسنت کی نصوص وتصریحات معدود ہیں، زیادہ تر اصول وکلیات ہیں، اِدھر زمانہ کو قرار نہیں، حالات میں تغیر ہوتے چلے آرہے ہیں، زمانہ اپنی ہر نئی کروٹ کے ساتھ نت نئے تقاضے لے کر سامنے آتا ہے اور رہتی دنیا تک یہی نقشہ رہے گا؛ لہٰذا ان مسائل ومعاملات سے عہدہ بر آہونے اوران سے متعلق شرعی احکام کی تشخیص وتعیین کے لئے سوائے قیاس کے اورکوئی چارہ کار نہیں، اس بناء پر نئے پیش آمدہ مسائل سے متعلق فروعی احکام کے اثبات کے معاملہ میں قیاس فقہ کا ایک ایسا اہم اور وسیع الاثر ماخذ ہے جس سے بکثرت سابقہ پیش آیا کرتا ہے۔(چراغِ راہ:۳۶۵)

اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے:۔

النصوص معدودة والحوادث غير متناهية (حاشیہ اعلام الموقعین ۱/۳۱۲)

نصوص گنتی کے قابل اور چند ہیں اور حوادث ومسائل کا حال یہ ہے کہ ان کی کوئی انتہا نہیں۔

امام الحرمینؒ فرماتے ہیں:

نصوص الكتاب والسنة محصورة مواقع الاجماع معدودة متناهية والوقائع لانهاية لها (نفائس الاصول ۷/۳۲۰۴ الغیاثی:۴۳۰)

یعنی کتاب وسنت کی نصوص محدود ہیں اور اجماعی مسائل معدودے چند ہیں جب کہ مسائل کا ایک غیر متناہی سلسلہ ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں قیاس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں)

حضرت امام بن حنبلؒ نے بالکل بجا فرمایا کہ:

،،کوئی شخص بھی قیاس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا'' قضاء وافتاء کا کام بغیر اس کے چل ہی نہیں سکتا، جدید پیش آمدہ مسائل کا حل بھی ان کے اشباہ ونظائر پر قیاس کئے بغیر نہیں ہوسکتا،

الحاصل یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قیاس ایک ابدی شریعت کا دائمی ساتھی ہے۔

حجیت قیاس

اللہ جل شانہ نے آیات قدرت وخلق اور آیات احکام ہر دو کے ذریعہ قیاس کے حجت ہونے کی جانب رہنمائی فرمائی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِندَ اللّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُون

بے شک حالت عجیبہ عیسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشابہ حالت عجیبہ آدم کے ہے کہ ان کو مٹی سے بنایا پھر ان کو حکم دیا کہ ہوجا بس وہ ہوگئے۔ (آل عمران: ۵۹ ترجمہ حکیم الامت)

اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی خلقت و پیدائش کو آدم علیہ السلام کے وجود ونشاۃ پر قیاس کیا گیا، دونوں کے مابین علتِ جامعہ کمالِ قدرت خداوندی کے علاوہ دونوں پیغمبروں کا بغیر باپ کے ہونا ہے۔ (مقدمہ اعلاء السنن ۲/۷۹) ایک اور مخصوص پس منظر میں درجِ ذیل آیات نازل کی گئیں:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِيُ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيْ أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (سورہ یٰس)

اور اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا کہتا ہے کہ ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کردے گا آپ جواب دیجئے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے اول بار ان کو پیدا کیا اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

ان آیات میں علتِ مشترکہ کمالِ قدرت کی بناء پر؛ نشاۃ ثانیہ اور بعث بعد الموت کو نشاۃ اولیٰ پر قیاس کر کے ثابت کیا گیا، آیاتِ احکام میں قیاس کا استعمال اس طرح پر ہوا ہے:

سورہ نور کی آیت: ۳۱ میں عورتوں کو بتلایا گیا کہ ''آباء واجداد سے پردہ ضروری نہیں'' بقیہ چچا اور ماموں کو اس فہرست میں شامل کرنے کی ذمہ داری خود بندوں کے سپرد کی گئی، سورہ احزاب کی آیات: ۴۹ میں یہ احکامات دیئے گئے کہ مطلقہ مومنہ غیر مدخول بہا پر کوئی عدت نہیں، اب لا محالہ قیاساً مطلقہ کافرہ غیر مدخول بہا بھی اس حکم میں داخل ہوں گی کہ اسقاط عدت کی بنیاد ایمان نہیں بلکہ مطلقہ کا غیر مدخول بہا ہونا ہے۔ (مقدمہ اعلاء السنن ۲/۸۰-۸۳)

سنت سے قیاس کا ثبوت

آپ ﷺ کے قول وعمل ہر دو سے قیاس کا حجت ہونا ثابت ہے، ذخیرہ احادیث میں ایسے ارشاداتِ عالیہ افراط کے ساتھ ملیں گے جو کسی نہ کسی اعتبار سے علل واوصاف موثرہ سے مربوط ہیں، آپ ﷺ کی نگاہ میں اس کا ایک عظیم مقصد یہ بھی تھا کہ مجتہدینِ امت اصل علت سے رہنمائی حاصل کر کے جدید پیش آمدہ مسائل کا شرعی حل دریافت کریں، سور ہرۃ (بلی کے جوٹھے) کے بارے میں ارشاد گرامی ہے:

انها ليست بنجس انها من الطوافين عليكم او الطوافات (ابوداؤد ۱/۱۱)

کہ بلی کا جوٹھا ناپاک نہیں ہے کیوں کہ وہ ان جانوروں میں سے ہے جن کی گھروں میں کثرت سے آمدورفت رہتی ہے۔

ایک نکاح میں عورت اور اس کی چچی یا خالہ کو جمع کرنے کی ممانعت میں فرمایا گیا:

انكم ان فعلتم ذلك قطعتم ارحامكم (المعجم الکبیر ۱۱/۳۳۷)

کہ اگر تم ایسا کرو گے تو رشتہ وتعلقات میں دراڑ کا سبب بنو گے۔

مس ذکر کے عدم ناقص وضو ہونے کو یہ علت بیان کر کے سمجھایا گیا: **هل هو الا بضعة منه** (ترمذی ۱/۲۵)

کہ عضو تناسل دیگر اعضاء بدن کی طرح بدن کا ایک حصہ تو ہے۔ (پھر اس کے چھونے سے وضو کیوں ٹوٹے گا)

بوس وکنار کے مفسد صوم نہ ہونے کو آپ ﷺ نے تشبیہ دی کلی کرنے سے کہ جس طرح تناول طعام کے مقدمات (منہ میں پانی لینا کلی وغیرہ کی غرض سے) کو تناول طعام نہیں کہا جاتا،

اسی طرح مقدمات جماع (بوس وکنار) کے مرتکب کو مجامع نہیں کہا جائے گا۔(مقدمہ اعلاء السنن ۸۵/۲)

اثبات قیاس کے باب میں حدیث معاذؓ شانِ امامت کا درجہ رکھتی ہے، ابوعون کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو جب یمن بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو معاذؓ کو بلا کر پوچھا کہ بتاؤ معاذ کوئی قضاء درپیش ہوجائے تو کس طرح اس سے نمٹو گے عرض کیا یا رسول اللہ کتاب اللہ کی روشنی میں، آپ ﷺ نے پوچھا کہ کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ ملے تو، جواب دیا سنت رسول ﷺ میں تلاش کروں گا آپ ﷺ نے پھر معلوم فرمایا کہ سنت میں اس کی صراحت نہ ملے تو کیا کروگے؟ دست بستہ عرض کیا یا رسول اللہ مقدور بھر اجتہاد کروں گا، اپنے فرستادہ معاذؓ کے اس جواب پر فرط مسرت میں آپ ﷺ نے ان کے سینہ پر دست شفقت رکھا اور حمد وثنا کے ساتھ ان کے طرز اجتہاد کی تصویب فرمائی۔(ترمذی ۲۴۷/۱)

اجماع سے قیاس کا ثبوت

ابن عقیل حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قیاس سے حجت واستدلال کرنا تواتر معنوی کی حد تک پہنچ چکا ہے، ابن دقیق العیدؒ کا کہنا ہے کہ جمہور امت کے نزدیک عمل بالقیاس ایک ایسی طئے شدہ حقیقت ہے کہ جو زمین کے ہر چپہ میں قرناً بعد قرن مشہور ومعروف رہی ہے۔(ارشاد الفحول:۳۰۳) مانعینِ زکوٰۃ سے قتال پر اجماع صحابہ ایک معروف بات ہے؛ احادیث کا ادنیٰ فہم رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اس کی بناء تارکین صلاۃ سے قتال پر تھی، حضرت ابوبکرؓ کی خلافت وامامت کبریٰ پر صحابہ کا اجماع کیا امامت فی الصلاۃ پر مبنی نہیں تھا؟ انکار ہو تو کیا کتب احادیث کے اس ٹکڑے کو:

رضیه رسول الله لدیننا افلا نرضاه لدنیانا (حجیۃ القیاس:۶۶)

کہ جس شخصیت کا انتخاب رسول اللہ نے ہمارے دین ونماز کے لئے کیا ہے، ہماری دنیا ومعاش کی قیادت کے لئے اس سے موزوں اور کوئی ہوسکتا ہے؟

صحابہ کی حین حیات حضرت عمرؓ کی حکمت سے معمور بصیرت افروز نگارشات کیا حجیت قیاس کے لئے کافی نہیں، حضرت عمرؓ اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو

مقدمات کے فیصلے کرنے کے اصول وطریقہ کار سے متعلق چند نہایت اہم ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمہارے قلب میں جب کسی ایسے معاملہ کے متعلق کھٹک ہو جس کا کوئی حکم کتاب وسنت میں موجود نہ ہو تو اس پر تردد واشکال کے وقت اپنے فکر ونظر کو کام میں لاؤ اور واقعہ کی نوعیت کے سارے پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ کر بنظر غائر جائزہ لو پھر ان کے اشباہ ونظائر کو تلاش کرو اس کے بعد ان نظائر کو سامنے رکھ کر قیاس کرو اور اس بات کا پورا لحاظ رکھو کہ جو عند اللہ اقرب ہو اور زیادہ سے زیادہ جو حق کے مشابہ ہو اس پر تمہارا اعتماد قائم ہو سکے۔ (چراغ راہ: ۲۶۵ اعلام الموقعین ۹۲/۱)

ہم اس بحث کو امام شافعیؒ کے شاگردِ رشید اور ان کے دست راست امام مزنیؒ کے چند نہایت بلیغ ونادر کلمات پر ختم کرنا چاہتے ہیں، وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ عہد نبوی سے لے کر ہمارے اس دور تک تمام فقہاء نے زندگی کے ان سارے معاملات میں قیاس سے کام لیا جن کے لئے دینی احکام کے اثبات واظہار کی ضرورت پڑی اور اس مدت کے تمام علماء کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ حق کی نظیر حق ہوتی ہے اور باطل کی نظیر باطل؛ لہٰذا کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ قیاس کا انکار کرے کیوں کہ قیاس کا مآل ومفاد اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ان امور میں کتاب وسنت کے مشابہ اور اس کے مثل ہے جن سے کتاب وسنت خاموش ہیں اور جب نظیر حق ہوتی ہے تو قیاس جو حق کی نظیر ہے وہ بھی حق ہوگا۔ (چراغ راہ: ۲۶۸، اعلام الموقعین ۱۹۷/۱)

فسادِ فکر کا فتنہ

فکری انحراف ، بے بصیرتی ، فاسد فہم کا تعلق موجودہ دور کے ان فتنوں میں سے ہے جو سنگین ہونے کے علاوہ وسیع اور ہمہ گیر بھی ہیں ،بمشکل ہی کوئی شعبۂ زندگی ایسا باقی ہو، جو اس فتنہ کی دست بُرد سے محفوظ رہا ہو، سماجیات سے سیاسیات تک ہر طرف اسکے نامسعود مظاہر فضا کو مکدر کیئے ہوئے ہیں ،لیکن ادھر جب سے اس فتنہ نے خانۂ دین میں دخل اندازی کی ہے،صورتِ حال کی سنگینیت مزید دوچند ہوگئی ہے، دین بجائے پیشوائے دین کے پیغام کا ترجمان ہونے کے ، نادان پیروکاروں کی تشریحات کا تابع ہوکر رہ گیا ، بدقسمتی سے آج کل مذہبِ اسلام پر بھی اس فتنہ کی یلغار ہے ،جس کا اثر یہ ہے کہ ایک مخصوص دائرہ میں دینِ مصطفیٰ ﷺ چند نام نہاد مفکرین اور بے بصیرت دانشوروں کے مابین بازیچۂ اطفال ہوکر رہ گیا،خودساختہ وخانہ زاد مفاہیم کوتراش تراش کرصاحبِ شرع کی طرف منسوب کیا جارہا ہے، فہمِ دین کے حقیقی سرچشموں سے بے خبر رہ کر محض اپنی محدود معلومات ہی کو کل کائنات باور کیا جارہاہے،تعبیر وتشریح میں امت کے باتوفیق طبقے (صحابہ وسلفِ صالحین) کی وساطت کو، سہل انگاری کے پیشِ نظر یا خود رائی کی بنا پر غیر ضروری سمجھا جارہاہے، امت کی اجماعی فکر سے اختلاف کرنے کو بجائے قصورِ فہم قرار دینے کے بلند فہمی کی دلیل گردانا جارہاہے، دینی مسائل سے معمولی یا رسمی شدبُد کو کل دین میں استحقاقِ رائے زنی کیلئے کافی سمجھا جارہاہے، یہ چند سرسری عنوانات ہیں،اس بگاڑ کے جنھیں فتنۂ فسادِ فکر نے نقشۂ عالم پر ثبت کیا ہے۔

فسادِ فکر کا اصل مبدأ ذہنی آوارگی اور اپنی عقل پر ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہے ،نصوص فہمی میں سلیم الفکر والطبع افرادِ امت کے افکار اور ذہنی حاصلات کو خاطر میں لائے بغیر آزادانہ اجتہاد کرنا ، بسا اوقات آدمی کو غیر محسوس طریقہ پر مذہب کی اصل شاہراہ ہی سے ہٹا دیتا ہے،ایسی ذہنیت کا حامل انسان درحقیقت اپنی اس غیر مستقل عقل کا غلام ہوتا ہے، جس پر

کئی ایک داخلی وخارجی عوامل اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، ایسا شخص اگر کسی اور کی رائے کونقل کرتا بھی ہے تو اس کی نوعیت نقل برائے نقل کے سوا کچھ نہیں ہوتی، نہ اس پر وہ اپنے مدعا کے ثبوت کوموقوف سمجھتا ہے اور نہ ہی اسے منقول عنہ کی شخصیت سے کوئی بحث ہوتی ہے، وہ تو بس کسی طرح اپنے نظریہ کو مدلّل کرنا چاہتا ہے، اس طرح ایک طرف تو وہ ایک جدید مکتبِ فکر کا بانی ہوتا ہے، اور دوسری طرف ایسی شاذ آراء کا اشاعت کار ہوتا ہے، جنہیں اجتماعی طور پر امت نے کوڑے دان کی نذر کر دیا ہے۔

یہی وہ بنیادی سبب ہے جو ہندوستان میں متجددین کے سرخیل سید احمد خان مرحوم کی فکری گمراہی کا باعث بنا ہے، ان کے معروف سوانح نگار، ان کے طرز بحث وتحقیق کے بارے میں بصراحت لکھتے ہیں: وہ جب تک کسی مسئلہ کی نسبت خود اپنی کوئی رائے قائم نہ کر لیتے تھے، اس وقت تک کتابوں کی طرف بہت ہی کم رجوع کرتے تھے، پھر اگر کسی مصنف کا قول ان کے موافق نکل آتا تھا تو اس کو بھی وہ اپنی رائے کی تائید کے لئے لکھ دیتے تھے ورنہ صرف اپنی رائے لکھ دینے پر اکتفا کرتے تھے (حیاتِ جاوید: ۲۱۹)

سوانح نگار نے اگرچہ اس چیز کو ان کے محاسن وامتیازات سے شمار کرایا ہے مگر فی الحقیقت یہی چیز ہے جس نے ان کا سارا کیا کرایا اکارت کر دیا ہے، مذہب کے معاملہ میں اُن کی فکر نے جو بے ہنگم قلابازیاں کھائیں ہے، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں، اصول وفروع سے متعلق وہ مسائل جن میں انہوں نے جمہور کے برخلاف انوکھی راہ اختیار کی ہے ان کی طویل فہرست موصوف کی مشہور سوانح حیاتِ جاوید میں موجود ہے۔ (حیاتِ جاوید: ۵۲۴۔۵۳۴)

ابھی حال ہی میں فسادِ فکر کا ایک اور نمونہ سامنے آیا ہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسلامیات کے پروفیسر نے مخلوط تعلیم کے جواز پر مضحکہ خیز طور پر اساری بدر (غزوۂ بدر کے جنگی قیدیوں) کے قضیہ سے استدلال کیا ہے، چنانچہ تحریر کرتے ہیں: گرفتار شدگان میں جو تعلیم یافتہ تھے، ان کا فدیہ جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ مقرر فرمایا کہ وہ مدینہ کے ناخواندہ بچوں کو تعلیم دیں، اس سرکاری حکم نامہ میں آپ ﷺ نے جنس (مذکر ومؤنث) کی تفریق نہیں کی ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۴/فروری ۲۰۰۹ء) اتنے جملہ سے مخلوط تعلیم کا جواز کیسے نکل آیا و

ہ تو پروفیسر موصوف کا ذہن رسا ہی جانے ، البتہ بادی النظر میں اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ نص مذکور سے طبع زاد حاشیہ آرائی کے بغیر یہ فاسد نتیجہ برآمد ہونا ناممکن ہے، اور ظاہر ہے نص کو اس کے واقعی معنی سے کم یا زائد معنیٰ کا جامہ پہنانا یا کسی مطلق نص کو قبل ازیں یا بعدازیں وارد شدہ صریح نص کے سیاق کے بغیر سمجھنا، اصولِ استدلال کے اعتبار سے بڑی فحش غلطی ہے۔

علامہ ابن القیمؒ نے ایک سے زائد نظائر کی روشنی میں ، اپنی نادرِ روزگار تصنیف اعلام الموقعین میں اصولِ استدلال کی اس عمومی غلطی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔(ملاحظہ ہو:۱/ ۲۴۲۔ ۲۴۸) علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: بعض بدعت پرستوں نے فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم: کل بدعة ضلالة سے غلط استدلال کرتے ہوئے یہ بات نکالی ہے کہ اس سے مراد وہ امور ہیں، جن کے ممنوع ہونے کا واضح حکم موجود ہے، لہذا؛ وہ بدعات جو بعد میں پیدا ہوئی ہیں، جن پر صریح ممانعت موجود نہیں ہے، وہ گمراہی کی چیز نہیں، علامہؒ فرماتے ہیں: یہ طرزِ فہم وفکر تاویل نہیں بلکہ صاف سیدھی تحریف ہے، جس سے نصوص شرعیہ بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں، غور کرو اگر بدعات، ممنوعات شرعیہ ہی کا دوسرا نام ہوتا تو پھر بدعت کا لفظ ہی کیوں بولا جاتا (اقتضاء الصراط المستقیم:۲۷۳)

زمانۂ رسالت میں ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ واسامہؓ کے یہاں دو، ریشمی جوڑے روانہ فرمائے ،حضرت اسامہؓ نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ ریشمی کپڑے کی خرید وفروخت کے مباح ہونے پر قیاس کرکے اس کے پہننے کو مباح تصور کیا اور پہن بھی لیا، حضرت عمرؓ نے ریشمی کپڑوں کے پہننے کی ممانعت کو اصل سمجھ کر کسی اور طریقہ سے فائدہ اٹھانے کو بھی ناجائز سمجھا اور کپڑا واپس کردیا، رسول اللہ ﷺ نے دونوں کے خیال کی اصلاح فرمائی، حضرت عمرؓ سے فرمایا میں نے تمہارے پاس ریشمی کپڑا اس لئے بھیجا تا کہ تم پوشاک بنانے کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے اس سے نفع اٹھالو اور حضرت اسامہؓ سے فرمایا میں نے تمہارے پاس کپڑا اس لئے نہیں بھیجا کہ تم خود اس کو پہنو بلکہ اس لئے روانہ کیا تھا کہ اس کو پھاڑ کر اپنی عورتوں کے لئے ڈوپٹہ بنالو۔اس برموقع ہدایت سے دراصل آپ ﷺ نے دونوں بزرگان کی اس غلط فہمی کو دور فرمایا جوان کو ریشم پہننے سے متعلق قبل ازیں واردشدہ شرعی ممانعت سے لاحق

ہوئی تھی، آپ ﷺ نے مسئلہ صاف کر دیا کہ ریشم پہننے کی ممانعت بدستور اپنی حالت پر باقی ہے اور یہ ممانعت صرف لُبس اور پہننے کی حد تک ہے۔(اعلام الموقعین ۱/۲۶۶)

خیر القرون میں نصوص فہمی کے حوالے سے فکری انحراف کو کسی قیمت گوارہ نہیں کیا گیا خواہ یہ انحراف کتنے ہی مخلصانہ طور پر ہو، امت کی اجماعی فکر سے اختلاف کر کے کسی نے کوئی فاسد رائے اختیار کی ہو تو صحابہؓ نے اس پر سخت گرفت کی ہے، ذیل میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت کے ایک دو واقعات بطورِ استشہاد نقل کئے جاتے ہیں: حضرت قدامہؓ ابن مظعون اور ان کے بعض ساتھیوں نے سورۂ مائدہ کی آیت: ۹۳ سے شربِ خمر (شراب نوشی) کے حلال ہونے کا مفہوم اخذ کر کے شراب نوشی کر لی تھی، جب حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی تو آپؓ نے یہ قضیہ صحابہؓ کے سامنے رکھا، سبھوں نے باتفاق کہا، قدامہؓ اور ان کے ساتھیوں نے کتاب اللہ کا ایسا مفہوم لیا جس کی تغلیط خود آیت کا سباق (بعد کا حصہ) کر رہا ہے، کسی صورت میں ان کا اخذ کردہ مفہوم درست نہیں، ان سے توبہ کرائی جائے اگر وہ توبہ کر لیتے ہیں تو ان پر حدِّ شربِ خمر جاری کی جائے اور اگر اپنے موقف پر مُصر رہتے ہیں تو وہ مرتد ہیں اور سزائے قتل کے حقدار ہیں، سبھوں نے توبہ کی اور اپنی رائے سے رجوع کیا پھر ان پر شراب پینے کی سزا نافذ کی گئی۔(ازلۃ الخفاء ۲/۳۳۷۔مصنف عبدالرزاق: ۱۷۰۷۶ و مصنف ابن ابی شیبہ ۹/۵۴۶) سورۂ مؤمنون کی آیت: ۶ سے غلط فہمی کی بناء پر ایک عورت، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اپنے غلام سے تمتع کر بیٹھی تھی، صحابہؓ کرام کی مجلسِ شوریٰ میں جب اس کا معاملہ پیش کیا گیا تو سب نے بالاتفاق کہا کہ: تاولت كتاب الله غير تاويله اس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا غلط مفہوم لے لیا(تفسیر القرطبی ۱۲/۱۰۷)

تشریح کتاب وسنت کے سلسلہ میں، صحابہ وسلف صالحین کی حیثیت، ان قانون دانوں جیسی ہے جو قانون بنتے وقت سے قانون داں کی حیثیت سے حاضر باش رہے ہوں اور قوانین کا بیشتر حصہ بھی، ان ہی کے احوال وظروف کے پیش نظر مدون ہوا ہو، ظاہر ہے ان حضرات کو کتاب وسنت کے قوانین کی معرفت پر جو دسترس وبصیرت حاصل رہے گی، دوسروں کو اس کا عشر عشیر بھی میسر ہونا مشکل ہے۔

حضرت امام شافعیؒ ارشاد فرماتے ہیں: صحابہ کے بلند ترین مناقب حدِ بیان سے باہر ہیں، انہوں نے ہم کو رسول اللہ ﷺ کی سنن سے آگاہ کیا، رسالت مآب ﷺ پر نزولِ وحی کے زمانہ میں وہ آپ ﷺ کی خدمت میں موجود رہے، رسول اللہ ﷺ کے منشاء ومراد کو زبان وبیان کی پوری نزاکتوں کے ساتھ انہوں نے جانا، علم واجتہاد، ورع وعقل اور ملکۂ استنباط میں وہ ہم سے فائق ہیں، سننِ نبوی کی معرفت میں وہ ہم سے برتر، ان ہی کی رائے ہمارے نزدیک قابل تعریف، ان ہی کا فہم قابلِ قبول، کسی قیمت پر ہم ان کے اقوال سے تجاوز نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ ان میں سے کسی نے کوئی بات کہی ہو اور کوئی اس کا مخالف نہیں تو ہم متعین طور پر اسی ایک کے قول کو اختیار کریں گے۔ (اعلام الموقعین: ۱/۸۵)

صحابہ کے بعد، سلامتی فکر وفہم کا مایۂ گراں، انکے تربیت یافتہ تلامذہ کے حصہ میں آیا، پھر یہ ورثہ آگے منتقل ہوتا رہا اور ہر صاحبِ نصیب اپنے ظرف کے مطابق حصہ پاتا رہا، پس سلفِ صالحین کی گرانقدر اور سند یافتۂ صحت، تشریحات سے بے پروانہ روگردانی کرنا، دانستہ یانادانستہ ان کی خلاف ورزی کرنا، اپنی نئی نئی نام نہاد تحقیقات سے عملاً ان پر، اپنا علمی تفوّق جتلانا، سخت بے دینی کی راہ ہے، خطرہ ہے کہ ایسا سوءِ فہم، کہیں سوءِ خاتمہ کا سبب نہ بن جائے۔ **العیاذباللہ العلی العظیم!۔**

عریانیت اور فحاشی کا سیلاب

اس وقت پوری دنیا میں بڑے منظّم انداز کے ساتھ عریانیت کو فروغ دیا جارہا ہے، پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا، ہر ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے جی جان کی کوشش کررہے ہیں، اس مسابقت کی وجہ سے تباہی، دنیا والوں کا حصہ اور مقدر بن چکی ہے، دنیا والے اب اس برائی کے نہ صرف عادی وخوگر بن چکے ہیں بلکہ یہ جرثومہ، ان کی طبیعت و فطرت کا حصہ بن رہا ہے۔

ایسی بات نہیں کہ عریانیت کے فروغ سے میڈیا کے علمبرداروں کا مقصود صرف انسانی ہوس اور خواہشاتِ نفسانی کی تسکین ہے، بلکہ میڈیا کے سرغنوں کا ٹارگٹ اور نشانہ وہ بیش بہا اور لاقیمت پونجی ہے، جو انسانیت کو انسانیت کے دائرہ میں روکے رکھتی ہے اور جب وہ ہاتھ سے چلی جائے تو انسان بلاتوقف جانوروں اور حیوانوں کے ریوڑوں سے جاملتا ہے، یہ ایمان واخلاق کی پونجی ہے، عقیدۂ آخرت اور حساب وکتاب کے استحضار کی لاثانی دولت ہے، انسان کو اگر اس سے ننگا کردیا جائے اور نوع انسانی اس سے اگر دست بردار ہوجائے تو دنیا کی پشت پر اس کا وجود بےکار ہے، نہ اس کو اپنی بقاء کا کوئی حق ہے اور نہ ہی اس کے بقاء کو گوارا ہی کیا جاسکتا ہے۔

جسمانی عریانیت، دراصل لازمہ اور ثمرہ ہے، روحانی عریانیت کا، برہنگی اور عریانیت کے باربار مشاہدہ سے پہلے دل اور روح بےلباس ہوتی ہے پھر بدن سے کپڑے اترنے لگتے ہیں۔

اسلام نے عریانیت کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا ہے، ستر وحجاب کی انتہاء یہ کہ مشہور نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم، ایک دفعہ آپ ﷺ کے یہاں تشریف لائے، آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ کو پردہ فرمانے کا حکم فرمایا، ازواج مطہرات کو تعجب ہوا کہ نابینا انسان کے سامنے پردہ کیسا، عرض کیں یارسول اللہ

ﷺ، کیا وہ نابینا نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، تو کیا تم بھی اندھی ہوگئی ہو، وہ تم کو نظر نہیں آتے؟ (ترمذی:۱۸۸۹)

اسلام نے ان چور دروازوں کو روا ہی نہیں رکھا کہ جہاں سے عریانیت کسی معاشرہ میں در آتی ہے، عام حالات میں عورتوں کو اپنی چہار دیواری ہی میں رہنے کی تلقین کی ہے کہ یہی ان کے حق میں گوشۂ عافیت ہے، بلا ضرورت اپنے مرکز سے نہ ہٹنے کی تعلیم و تلقین کی حد یہ کہ نماز جیسی عظیم الشان عبادت کے معاملہ میں بھی مسجد کے بجائے گھر ہی کو مصلّٰی گاہ بنانے کو بہتر بتلایا گیا ہے، کسی ضرورت سے باہر نکلنا ہو تو ستر و حجاب کے متعلقہ قوانین کی رعایت لازم قرار دی گئی ہے، ایسی کسی ہیئت و حرکت سے منع کیا گیا، جو اجنبی مردوں کی کشش کا باعث بنے، بوڑھی اور سن رسیدہ عورتوں کو پردہ کے معاملہ میں شریعت نے نسبتہً تخفیف رکھی ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں ''غیر متبرجٰت بزینة'' (سورۂ نور:٦)

مستورات کے لئے ساتر لباس اختیار کرنے کی عادت اس شدت کے ساتھ ڈلوائی گئی کہ گھر کی چہار دیواری میں بھی اس میں لچک گوارا نہیں کی گئی، حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ: صدیق اکبرؓ ایک دفعہ اپنی بیٹی حضرت اسماءؓ کے یہاں داخل ہوئے، حضرت اسماءؓ نسبتاً باریک کپڑے زیب تن کی ہوئی تھیں، صدیق اکبرؓ نے ان سے رخ پھیر لیا اور فرمایا، بیٹی اسماءؓ، جب عورت سنِ بلوغ کو پہنچ جاتی ہے تو اس کے بدن سے سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے کچھ نہیں نظر آنا چاہیے۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوۃ:۳۷۷)

خود حضرت عائشہ صدیقہؓ کا طرزِ عمل یہ کہ آپؓ کی بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰنؓ ایک دفعہ آپؓ سے ملاقات کے لئے آئیں، ان کے سر پر باریک ڈوپٹہ تھا، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے ان سے اس ڈوپٹہ کو لیا اور دو حصوں میں پھاڑ دیا، پھر اپنے پاس سے موٹا ڈوپٹہ اڑھایا۔ (موطا مالک بحوالہ مشکوہ ص:۳۷۷)

آج کی تہذیب، عورتوں کو عریانیت پر نہ صرف ابھارتی اور اکساتی ہے بلکہ ایسی بدکار عورتوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے، عریانیت کی یہ فضا خود ان عورتوں اور ان کے ہمنواؤں بلکہ پوری انسانی برادری کے حق میں تباہ کن ثابت ہو رہی ہے، عصمتوں پر ڈاکہ، آپس میں قتل و

خونریزیاں، صحت ودولت کی بربادی، برسرعام عورتوں کا اغواء وغیرہ وغیرہ، ان سارے جرائم کا تعلق اسی بڑھتی ہوئی عریانیت سے ہے۔

اسلام نے عریانیت کی رتی برابر بھی تائید یا ہمت افزائی نہیں کی بلکہ ایسی بے حیاء عورتوں کو لعنت کا اور نارِ جہنم کا پروانہ دیا ہے، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

''سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا: میری امت کے آخری زمانہ میں کچھ لوگ ہوں گے وہ مساجد کے دروازوں پر اتریں گے، ان کی عورتیں لباس پہن کر بھی بے لباس ہوں گی، ان عورتوں کے سروں پر کمزور اونٹ کے کوہانوں کی طرح کوئی چیز ہوگی، ان پر لعنت کرو، کیوں کہ وہ ملعونہ ہیں۔ (مسند احمد ۲۲۳/۳) اس حدیث میں پہلے مردوں کی صفت اس لیے بیان کی گئی ہے کہ وہ لوگ مسلمان اور نمازی ہونے کے باوجود اپنی عورتوں کو نیم برہنہ لباس پہننے سے نہیں روکیں گے، اس لیے مرد نہیں بلکہ، مردوں کی طرح کسی جنس کے افراد ہوں گے، حقیقی مرد تو وہ ہے جو اپنی عورتوں کو بے حیائی کے کاموں سے روکے، اپنی عورتوں کے ستر کو غیر مردوں کی نگاہوں سے بچائے، نہ یہ کہ وہ خود اپنی خواتین کو باریک اور چست لباس اور کپڑے لا کر دے جن میں ان کا جسم صاف جھلکے، وہ لباس پہننے کے باوجود ننگی رہیں کہ لباس کا جو مقصد ستر پوشی ہے، وہ حاصل نہ ہو۔

عریانیت اور برہنگی، نجی، شخصی اور تنہا ایک گناہ نہیں بلکہ متعدی اور کئی ایک گناہوں کا اذیت ناک مجموعہ ہے، خدا اور اس کے رسول ﷺ کو ناراض کرنا ہے، انسانی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرنا ہے، بے حیائی، فحاشی اور بدکاری کی دعوت دینا ہے اور ان کو فروغ دینا ہے، معاشرہ میں گندگی، اخلاقی انارکی کو عام کرنا ہے، وغیرہ وغیرہ، غرض، عریانیت، نفسانی، جذباتی، جنسی، اخلاقی، نوعیت کے تمام گناہوں میں بنیادی اور اولین کردار ادا کرتی ہے، آخرت میں اس پر جس قدر سنگین سے سنگین تر سزا تجویز ہوسکتی ہے اپنی جگہ بجا ہے۔

ادھر چند دہوں سے عریانیت وفحاشی کی ایک نقد سزا دریافت ہوئی ہے، سزا کیا وہ موت کا پروانہ ہے، جیتے جی انسان مرجاتا ہے معاشرہ و برادری سے کٹ جاتا ہے علیحدہ کردیا جاتا

ہے، یہ سزا اور بدترین سزا مرضِ ایڈس ہے، اس مرض کا وقوع نہ صرف یہ کہ عین قرینِ عقل و انصاف ہے بلکہ تکوینی نظام کے تحت اس کا واقع اور ظاہر ہونا عین مطابق ہے، رحمۃ للعالمین ﷺ کی زبانِ غیب بیاں سے نکلے ہوئے یہ کلمات آج کے معاشرے پر کس قدر سچ ثابت ہو رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا جب عریانی اور فحاشی عام ہو جائے گی تو لوگوں میں ایسی ایسی بیماریاں پیدا ہوں گی جن کے متعلق نہ تم نے پہلے کبھی سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء و اجداد نے ۔(سنن ابن ماجہ: ۴۰۱۹)۔ **اللھم احفظنا منھا** ۔ ہمارے ہندوستان میں نوے کی دہائی کے شروع میں ایڈس کے مریض کی تشخیص کی گئی، اس کے بعد سے ایڈس کے مریضوں میں اضافہ روز افزوں اور قابلِ دید ہے، مثال کے طور پر سال گذشتہ ہمارے ملک میں نئے متاثرین کی تعداد ۲۷,۰۰۰ (ستائیس ہزار) تھی، جواب معکوس ہندسوں میں بڑھ کر ۷۲,۰۰۰ (بہتر ہزار) ہوگئی ہے۔(ٹائمس اداریہ ۴؍جولائی ۲۰۰۶ء) ۲۰۰۵ء میں NACO نامی تنظیم نے ، ہندوستان میں 5.21 ملین، مثبت ایچ، آئی، وی (HIV-Positive) متاثرین کا اندازہ لگایا تھا، ایک دوسری تنظیم UN AIDS نے ذرا وسیع پیمانہ پر سروے کرتے ہوئے ملک میں ایڈس کے متاثرین کی تعداد 5.7 ملین بتلائی ہے۔(حوالۂ سابق) ایڈس سے متاثر ہو کر دنیا سے چل بسنے والوں کی تعداد بھی بڑی عبرت خیز ہے صرف ہندوستان میں سال گذشتہ ایڈس کی بنا پر چار لاکھ اموات واقع ہوئی ہیں۔

مضمون نگار کہتا ہے: UN AIDS کی حالیہ رپورٹ کے لحاظ سے سال ۲۰۰۵ء کے دوران ملک میں چار لاکھ ایڈس کی اموات نہ صرف لرزہ خیز ہیں بلکہ انسانیت کے بقاء پر سوالیہ نشان ہے۔(ٹائمس آف انڈیا، اداریہ مورخہ ۴؍جولائی ۲۰۰۶ء) ایک اور مضمون نگار نکولس ڈی کرسٹوف کے مطابق، اگر ایڈس کی موجودہ عالمی رفتار برقرار رہے تو مجموعی طور پر پوری دنیا میں ۲۰۲۰ء تک ایڈس سے مرنے والوں کی تعداد ۷۰ ملین تک پہنچ جائے گی۔(دکن کرانیکل ۷؍جون ۲۰۰۶ء) ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس تباہ کن صورتحال پر دنیا کے انسانوں کی آنکھیں کھل جاتیں اور رہنمایانِ قوم کا مردہ ضمیر جاگ جاتا اور تمام مل کر فحاشی و عریانیت کے ختم کرنے پر کمر بستہ ہو جاتے اور کم از کم اس سلسلہ میں اسلام کی سراپا رحمت تعلیمات کو اپنا لیا

جاتا اور انسانیت کی بھلائی اور خیر خواہی کی خاطر عناد و سرکشی اور اسلام دشمنی کو پس پشت ڈالدیا جاتا، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ بے حیائی و برہنگی کو ماضی کی تاریخ بنا دینے کی آواز کوئی نہیں بلند کرتا، معاشروں کو صاف ستھرا، پاکیزہ اور عریانیت سے محفوظ بنانے کی بات کوئی نہیں کرتا، بات اگر کی جاتی ہے تو ایڈس سے مدافعت کی، حیا سوز چیتھڑوں کے استعمال کی، ایڈس کے جڑ پیڑ سے خاتمہ کی بات کوئی نہیں کرتا، ایڈس سے مدافعت کی مذکورہ تجویز بے معنی اور غیر معقول ہونے میں بعینہٖ اس کے مانند ہے کہ بھڑکتی ہوئی جان لیوا آگ میں خود ساختہ آتش پوش پہن کر خود کو جھونک دینے کا مشورہ دیا جائے، یا کسی خونخوار درندے سے چند ابتدائی تدابیر کے بھروسہ پر، بار بار زور آزمائی کی تحریک کی جائے، ظاہر ہے اس طرح کی تجاویز مسئلہ کا دیرپا یا کامیاب حل نہیں قرار پاسکتیں، خطرہ سے حفاظت کے سلسلہ میں اس طرح کی تجاویز نہ صرف وقتی کہلاتی ہیں بلکہ بالفرض بار آور ہوں تو بھی ان کو اتفاق ہی کا نام دیا جائے گا۔ مؤثر، کامیاب اور دانشمندانہ حل یہ ہوگا کہ اس چیز کے قریب بھی نہ پھٹکا جائے، ایسے خطرے سے نبرد آزمائی کا ہرگز ارادہ نہ کیا جائے، جس کا جان لیوا ہونا یا کم ازکم سخت ضرر رساں ہونا، دو اور دو چار کی طرح یقینی ہے، قرآن پاک کی تعلیم یہی ہے، دین وشریعت کا تقاضا یہی ہے، یہی عقلِ سلیم کی اپیل بھی ہے۔

سورۂ اعراف میں ہے: اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ ہوں---- اس کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (الانعام: ۱۵۲) اور زنا کے پاس بھی مت پھٹکو، بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے اور بُری راہ ہے۔ (بنی اسرائیل: ۳۲)

ضرورت ہے قرآن کی ان انسانیت نواز تعلیمات پر عمل کرنے کی، کم ازکم انسانی بنیادوں پر اسلامی معاشرت کو اپنانے اور اختیار کرنے کی کوشش کی جائے۔

بے اطلاع دی ہوئی طلاق.... شرعی نقطہ نظر

ایک عرصے سے یعنی جب سے کہ آزادیٔ نسواں کا پرفریب آوازہ مغرب کی جانب سے بلند کیا گیا اور اُسے پوری دنیا میں متعارف کروایا گیا اس وقت سے اسلام کے عائلی مسائل خاص طور پر قانونِ طلاق، متجددین کی فکر وتشویش کے محور بن گئے، نت نئے گوشوں سے قانونِ طلاق کی معقولیت اوراس کے جواز کو چیلنج کیا گیا، اس کے بعض دفعات وجزئیات کو خود اپنے حلقوں سے بھی کتاب وسنت کے مخالف بتلایا جارہا ہے، حال ہی میں ایک نقطۂ نظر یہ سامنے آیا کہ (۱) عورت کی عدم موجودگی میں یا اس کو کسی پیشگی اطلاع کئے بغیر دی جانے والی طلاق (۲) اسی طرح ایک مجلس کی تین طلاق (۳) بحالتِ غصہ دی ہوئی طلاق، شریعت کے مطابق نہیں، اس لیے اس طرز پر دی جانے والی طلاق بے اثر رہنی چاہیے، قطع نظر اس بحث سے کہ ان نظریات کے پیچھے کونسے عوامل اور کیا محرکات کارفرما ہیں، اِن شبہات واعتراضات کے دفعیہ کے لیے درجِ ذیل مقدمات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) شرعاً وعقلاً طلاق کا اختیار تنہا ایک فریق کو حاصل ہے یا یہ اختیار فریقین کے درمیان مشترک اور دونوں کے ساتھ مربوط ہے۔

(۲) اگر صاحبِ اختیار فریق اپنے اختیار کو یکبارگی عمل میں لائے تو آیا اس کا یہ اختیار مؤثر رہے گا یا بے اثر ہوجائے گا۔

(۳) طلاق کے قضیہ میں آیا مطلق (طلاق دینے والے) کی نفسیاتی کیفیات کا بھی اعتبار کیا جائے گا اگر کیا جائے تو کب؟ اور کس حد تک؟

اس مختصر مضمون میں نہ ہی ان تینوں شبہات کا جائزہ لینا آسان ہے اور نہ ہی مذکورالصدر تینوں مقدمات پر بحث کا ارادہ ہے، فی الوقت پہلا شبہ اور مقدمۂ اوّل کے متعلق چند گذارشات قارئین کے سامنے رکھنے ہیں:

اس بات سے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ تخلیقی اعتبار سے مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے، مرد وعورت کی جسمانی ساخت اوران کے فطری وظائف میں کھلا تفاوت ہے مرد خلقۃً سخت جان وسخت کوش واقع ہوا ہے جب کہ صنفِ مخالف سرتاپا صنفِ نازک ہی سے عبارت ہے، میدانِ عمل میں مرد کی شخصیت تاثیری (اثر ڈالنا) عنصر کی حامل ہے اور عورت کا مزاج تاثری (اثر قبول کرنا) ہے اور اس میں عورت کی کوئی توہین یا تحقیر نہیں ہے، بلکہ یہ صورت کارِ جہاں کی تدبیر وانتظام کے لیے ناگزیر ہے، اگر کپڑے میں وہی سختی ہو جو سوئی میں ہوتی ہے تو سلائی کا عمل وجود میں نہیں آسکتا؛ اگر زمین میں وہی صلابت ہو جو کدال میں ہوا کرتی ہے تو پھر پھل اور پھول کی توقع ہی فضول ٹھہرتی ہے۔

تخلیق وترکیب کا یہ فرق ظاہر ہے احکام واختیارات کی دُنیا میں بھی ظاہر ہوگا، ایک معمولی انسان پر جب مثلاً عہدۂ صدارت ہی کا لیبل لگتا ہے تو اس کے حدود واختیارات دیگر ابنائے جنس کے مقابلے میں ناقابلِ بیان حد تک بدل جاتے ہیں، تخلیق وفطرت کا فرق تو اس سے کہیں آگے کی چیز ہے، اس لیے اختیارات پر اس کے اثرات پڑنا ایک بدیہی بات ہے، اختیارِ طلاق کے سلسلہ میں بھی بنیادی طور پر یہی عوامل کارفرما ہیں، شریعت نے چند در چند وجوہ کی بناء پر طلاق کا اختیار مرد کو سونپا ہے، اس لیے طلاق کے قضیہ میں مرد ہی مستقل اور اصل ہے، قرآن وحدیث میں جابجا طلاق کی نسبت مرد ہی کی طرف کی گئی ہے، کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں کہ جہاں بجائے مرد کے عورت کی طرف فعلِ طلاق کی نسبت کی گئی ہو۔

ان وجوہ کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) مرد کی قوامیت اور فطری برتری، یہ وہ بنیادی اور اوّلین سبب ہے جس کی بناء پر طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ رکھا گیا ہے، سطورِ بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسی سبب کی تشریح ہے۔

(۲) معاملہ طلاق کی نزاکت وسنگینیت، تلوار کے بارے میں جس طرح مشہور ہے کہ وہ آخرالحیل (آخری تدبیر) ہے، طلاق بھی بعینہ اسی طرح ابغض الحلال اور گویا آخری تیر ہے، یہ بات تجرباتی اور مشاہداتی طور پر ثابت ہے کہ زبان کے استعمال کے سلسلہ میں میاں اور

بیوی میں سے بیوی زیادہ بے لگام واقع ہوتی ہے، بات بات پر بے صبری کے مظاہرے اور شکوے شکایات کے بول آئے دن اس کے منہ سے نکلتے رہتے ہیں، طلاق کے چار حرفی بول کا اختیار اگر عورت کے سپرد ہوتا تو عین ممکن بلکہ یقینی بات ہوتی کہ نتائج وعواقب سے بے پرواہ ہوکر یہ صنفِ نازک، نا سمجھی اور طبعی جلد بازی کا مظاہرہ کرتی اور اپنے اختیار کا غلط استعمال کر بیٹھتی اور دنیا کو یہ دِن دیکھنا پڑتا کہ طلاق کا تناسب جو فی الحال ہی قابلِ تشویش بنا ہوا ہے اس میں مزید ابتری پیدا ہوجاتی۔

مرد چونکہ عورت کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ہوتا ہے اور وہ اس پر مسلسل خرچ کرتا رہتا ہے نیز اسے کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لانے کے لیے ایک معتد بہ رقم بطورِ مہر کے خرچ کرنی پڑتی ہے، پھر بعد از طلاق، نفقۂ عدّت، بعض صورتوں میں مطلقہ کو اجرتِ رضاعت وغیرہ دینے کی بھی نوبت آسکتی ہے، اس لیے ان تمام امور کو سامنے رکھتے ہوئے ایک معمولی سمجھ بوجھ والا مرد اپنے اختیارِ طلاق کو اسی وقت روبہ عمل لائے گا جب کہ وہ انتہائی ناگزیر ہوجائے۔

اس حقیقت کو نظر میں رکھتے ہوئے بجائے مرد کے عورت کو اختیارِ طلاق ملنے کی وکالت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی ناسمجھ بچے کے ہاتھ میں تلوار تھما دینے کی تائید کرنا، ظاہر ہے ایسے بے جا مشورے سے تلوار کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، جان یا تو بچے کی جائے گی یا اس کی جس کو بچہ اپنی طفلانہ کرتب بازی کا نشانہ بنائے (**المفصل فی احکام المرأة والبیت المسلم: ۳۴۸/۷**) (**الفقه الإسلامي وادلته: ۶۸۷۷/۹**)

یہ وہ بنیادی وجوہ ہیں جن کے پیشِ نظر شریعت نے اصلاً اور بالذات طلاق کا اختیار مرد کے حوالے کر رکھا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ عورت کسی صورت مرد کی پہل کے بغیر علیحدگی اختیار نہیں کرسکتی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے خلع کی شکل میں عورت کے لیے طلاق کی پیشکش کا حق محفوظ رکھا ہے جو بعد از رضامندیٔ زوج قابلِ اثر ہوسکتا ہے، اس طرح انعقادِ نکاح کے موقع پر اگر عورت حقِ طلاق کی شرط اپنے لیے محفوظ کرلے تو یہ حق بھی اسے اسلام نے دیا ہے ایسے ہی بعض مخصوص صورتوں میں (جیسے عدم ادائیگی نفقہ کی صورت میں) مرد کی رضامندی کے بغیر قاضی کی دخل اندازی سے زوجین کے درمیان جدائیگی ہوسکتی ہے، اس لچک اور گنجائش کے

ہوتے ہوئے قانونِ طلاق کو تنقید کا نشانہ بنانا کسی طرح معقول قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ طلاق کے معاملہ میں مرد ہی مستقل اور مختار ہے تو پھر اب اس کے نفاذ کے لیے فریقِ آخر (عورت) کی موجودگی یا اس کی رضامندی یا اس تک پیشگی اطلاع کی بحث سب لغو اور بے ضرورت قرار پاتی ہے اور یہ صرف طلاق ہی کی بات نہیں بلکہ یہی حال ان تمام تصرفات کا بھی ہے جو یکطرفہ ہوتے ہیں، انعقادِ یمین (قسم) ایسے ہی نفاذِ عتق کے لیے مقسم علیہ اور مُعْتَق (وہ غلام جس کو آزاد کیا جارہا ہے) کا نہ ہی موجود رہنا ضروری ہے نہ ہی ان کی رضامندی کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی پیشگی اطلاع کی؛ اسی طرح رجعت یعنی مطلقۂ رجعیہ کو عدت کے اندر اندر زوجیت میں واپس لینے کے مسئلہ میں نہ ہی مطلقہ کی موجودگی ضروری ہے نہ ہی اس کی رضامندی اور نہ ہی کوئی پیشگی اطلاع؛ ذیل کی احادیث ملاحظہ ہوں (۱) **انما الطلاق لمن اخذ بالساق (ابن ماجه والدار قطني عن ابن عباس، نيل الاوطار: ۲۳۸/۶ بحوالۂ الفقه الاسلامي وادلته: ۶۸۷۴/۹)**

طلاق کا حق اُسے حاصل ہے جو عورت کو اپنی زوجیت میں لے آئے (۲) **لاقيلولة في طلاق**، طلاق میں رجوع کی گنجائش نہیں (۳) **ثلاث جدهن جدو هزلهن جد، النكاح والطلاق والرجعة (مشكوٰة: ۲۸۴) (المفصل: ۳۷۱/۷) وفي رواية والعتاق وفي رواية اليمين (الفقه الإسلامي وادلته: ۶۸۸۵/۹)**

تین چیزیں ایسی ہیں جن کی واقعیت تو واقعیت ہے ہی، ان کا مذاق بھی واقعیت اور حقیقت کا حکم رکھتا ہے، وہ یہ ہیں: نکاح، طلاق، رجعت، دوسری روایات میں ان دو کا بھی اضافہ ہے عتاق، یمین، یہ صحیح ہے کہ اگر مرد واقعتاً طلاق کی ضرورت محسوس کرتا ہو تو اقدام طلاق سے قبل عورت کی تادیب کے ممکنہ طریقوں کو آزمالے، وعظ ونصیحت کرے اس سے کام نہ چل سکے تو بالترتیب خوابگاہ اور بستر الگ کردے، ہلکی سی سزا دے، جانبین سے حکم تجویز ہوں جو دونوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کریں، اب بھی کوئی شکل نہ بن پڑے تو طلاق دے کر عورت کو اپنی زوجیت سے علیحدہ کردے، ان مرحلہ وار اخلاقی اور تادیبی تدابیر کو بعض حضرات نے غلط فہمی سے شرائط کے درجہ میں سمجھ لیا ہے، حالاں کہ شرائط اور تادیبی تدابیر

کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے، شرائط، مشروط کے وجود کا ذریعہ بنتے ہیں، شرائط کے تحقق سے قبل مشروط کا وجود عملاً ناممکن ہوتا ہے، جب کہ مؤخرالذکر شکل میں حق کا ثبوت، ان تدابیر پر موقوف نہیں ہوتا، ان تدابیر کی رعایت زیادہ سے زیادہ مستحسن قرار پاسکتی ہے لازم نہیں، مرتد کی سزا شریعت نے قتل رکھی ہے، لیکن سزا کے اجراء سے قبل فہمائش ونصیحت کا حکم ہے، تاہم قتل کی سزا فہمائش ونصیحت سے قبل ہی جاری کردی گئی تب بھی کوئی مضائقہ یا جرم نہیں اسی طرح طلاق کا حق بھی مرد کو شریعت نے نکاح کے ساتھ ہی دیا ہے اگر وہ اپنے اس ثابت شدہ حق کو دفعتہً بروئے کار لاتا ہے تو اس کو بے اثر نہیں کیا جاسکتا۔

کتاب وسنت میں کئی مقامات پر ان تدابیر سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مرحلۂ اولی ہی میں طلاق کو بیان کیا گیا ہے، سورۂ تحریم میں ہے ''اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دیدے گا'' (آیت:۵) سورۂ نساء میں ہے ''اور اگر تم بجائے ایک بیوی کے دوسری بیوی کرنا چاہو اور تم اس ایک کو انبار کا انبار مال دے چکے ہو تم اس میں سے کچھ بھی مت لو'' (آیت:۲۰) سورۂ طلاق میں ہے ''اے نبی جب تم طلاق دو عورتوں کو تو اُن کو طلاق دو اُن کی عدت پر اور گنتے رہو عدت کو'' (آیت:۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے جب اپنی اہلیہ کو حالتِ حیض میں طلاق دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بابت یہ حکم فرمایا کہ وہ فی الحال اپنی بیوی سے مراجعت کرلیں، آئندہ حالتِ طہر میں چاہیں تو جماع کئے بغیر طلاق دیں (ملاحظہ ہو، مشکوٰۃ: ۲۸۳) یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست کسی تحکیم وغیرہ کی بات کئے بغیر ہی طلاق کی بات فرمائی ہے، خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی تھی پھر بحکمِ خداوندی ان سے مراجعت فرمالی، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طلاق کے ذیل میں کہیں اس کا ثبوت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحکیم وغیرہ کا عمل بھی اختیار فرمایا ہو، حضرت حسن رضی اللہ عنہ ابن علی رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ کثرت سے نکاح فرماتے اور طلاق دیا کرتے تھے (**المفصل فی احکام المرأۃ والبیت المسلم: ۳۵۲/۷**) غرض فی نفسہ طلاق کا اسلامی نظام اپنے استحکام ومعقولیت میں بے نظیر ہے، اگر کہیں افراد کی جانب سے افراط وتفریط کا مظاہرہ کیا جاتا ہے تو اس کا الزام قانون پر نہیں افراد پر ہوگا۔

ہمدردانہ قتل (EUTHANASIA) اسلامی نقطہ نظر

اسلام، مجبوروں اور بیماروں کے سلسلہ میں بڑا ہی ہمدرد اور فراخدل واقع ہوا ہے، بیمار اور مجبور افراد بظاہر، انسان کے سر پر بوجھ معلوم ہوتے ہیں، ان کی کفالت اور ان کی تیمارداری وغیرہ کو لوگ اگرچہ بارِگراں محسوس کرتے ہیں، تاہم اسلام کا مزاج یہ ہے **ھل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم** (بخاری، ریاض الصالحین: ۱۲۲) کہ ان ضعیفوں اور کمزوروں ہی کی برکت سے نہ صرف تمہاری نصرت وحمایت کی جاتی ہے بلکہ انہی کے صدقے میں تم کو روزی بھی فراہم کی جاتی ہے۔

نبی پاک ﷺ نے بہترین صدقہ، اس ستم کی ماری لڑکی کی کفالت کو قرار دیا ہے جو (مطلقہ یا بیوہ ہو جانے کی وجہ سے) باپ کے گھر لوٹا دی گئی ہو اور باپ کے سوا، اس کی دیکھ بھال کرنے والا اور بار اٹھانے والا کوئی اور نہ ہو (ابنِ ماجہ: ابواب الأدب)

بیماروں اور کمزوروں کی دلداری اور دلجوئی اسلام نے اتنی کی ہے کہ جہاد جیسی عظیم عبادت سے بھی ان حضرات کو مستثنیٰ رکھا ہے جو بیماروں کی تیمارداری میں مصروف ہوں یا جن کے گھر ضعیف ماں باپ خدمت کے محتاج ہوں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر سے محض اس بناء پر روک دیے گئے تھے کہ ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بیمار تھیں اور وہ ان کی تیمارداری میں مصروف تھے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ جہاد کی اجازت لینے کی غرض سے دربارِ اقدس میں حاضرِ خدمت ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے استفسار فرمایا کہ کیا تمہارے والدین موجود ہیں انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ **ففیھما فجاھد**، انہی کی خدمت میں جدوجہد کرو (بخاری ومسلم، ریاض الصالحین: ۱۳۷) خود مریض کے لیے بھی اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ اپنے مرض پر اور اپنی پریشانی پر صبر کرے جلد بازی سے کام نہ لے، یہ خیال کرے

کہ یہ عارضی مصیبت اس کے حق میں ایک بڑے خیر کا زینہ ہے، مؤمن کو تو ایک معمولی کانٹے کی چبھن سے لاحق تکلیف پر بھی اجر اور کفارۂ سیئات کا وعدہ ہے (ریاض الصالحین: ۳۹) مؤمن کی اس عجیب حالت کا نبی کریم ﷺ نے بڑے خاص انداز سے تذکرہ فرمایا کہ وہ خوشی اور مصیبت کی اپنی دونوں حالتوں میں خیر و اجر کا حقدار ٹھہرتا ہے، خوشی حاصل ہو تو شکر کر کے اور مصیبت پہنچے تو صبر کر کے (مسلم شریف، ریاض الصالحین: ۳۵)

مذہبِ اسلام میں مریض کے لیے مرض سے گھبرا کر کسی غیر شرعی اقدام کی ہرگز اجازت نہیں ہے، خدانخواستہ مریض قضائے خداوندی پر صبر کرنے کے بجائے اگر اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہے تو اسلام ایسے شخص کو دوزخی قرار دیتا ہے، مسلم شریف کی معروف حدیث ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم غزوۂ حنین کے موقع پر آپ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے ایک ایسے آدمی کے تعلق سے جو اسلام کا دعویدار تھا یہ پیشین گوئی فرمائی کہ وہ دوزخی ہے، جب میدانِ کارزار گرم ہوا تو اس آدمی نے بہادری کے خوب جوہر دکھلائے، اس اثناء میں اسے ایک کاری زخم لگا، رات ہوئی تو وہ اپنے زخم پر صبر نہ کر سکا اور اپنے آپ کو قتل کر ڈالا (مسلم مع الفتح: ۱/۲۶۷) اسی طرح مسلم شریف ہی میں سابقہ امتوں کے ایک آدمی کا واقعہ ہے کہ اس کے بدن پر کوئی پھوڑا نکل آیا جب وہ اسے ستانے لگا تو اس نے اپنے ترکش سے تیر نکالا اور اسے کریدا، جس سے اس کے بدن کا سارا خون بہہ نکلا یہاں تک کہ وہ مر گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قد حرمت علیه الجنة میں نے اس پر جنت حرام کر دی ہے (مسلم، فتح الملہم: ۱/۲۶۸)

ان تفصیلات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بیماری اور مصیبت سے عاجز ہو کر موت و زیست کے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا اختیار نہ خود مریض کو حاصل ہے نہ اس کے تیمارداروں کو اس کے برخلاف مغربی سوچ یہ ہے کہ وہ انسان، جس کا بظاہر معاشرے میں کوئی حصہ نہیں وہ معاشرے پر بوجھ ہے اسے معاشرے میں بلکہ اس دنیا میں بھی رہنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے، بیمار چوں کہ اپنی بیماری کی وجہ سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچا رہا ہے بلکہ دوسرے کو اپنی ضروریات کی تکمیل میں مشغول کئے ہوا ہے اس لیے اس کو اس دنیا میں رہنے

کا حق نہیں ہے، اس ذہنیت کی وجہ سے آج کل مغربی تہذیب یا اس سے متاثر حضرات بوڑھوں کے لیے جگہ جگہ OLD-AGE-HOME کا نظام چلا رہے ہیں اور اسی ذہنیت کی پیداوار یوتھینز یا (Euthanasia) ہے، ذیل میں یوتھینز یا کے تعلق سے ہم اسلام کا موقف واضح کریں گے۔

یوتھینز یا کی دو قسمیں ہیں (۱) عملی (Active) (۲) غیر عملی (Passive)۔

۱۔ ایکٹیو یوتھینز یا کی صورت یہ ہے کہ ڈاکٹروں کو مریض کو موت تک پہنچانے کے لیے کوئی مثبت عمل کرنا پڑے مثلاً کینسر کا مریض جو شدید تکلیف میں مبتلا ہو یا وہ مریض جو طویل بے ہوشی کا شکار ہو اور اس کے بارے میں ڈاکٹروں کا خیال ہو کہ اس کی زندگی کی اب کوئی توقع نہیں ہے، ایسے مریض کو درد کم کرنے والی تیز دوا زیادہ مقدار میں دے دی جاتی ہے جس سے مریض کی سانس رک جاتی ہے۔

۲۔ پیسیو یوتھینز یا (سلبی یا غیر عملی) کا مطلب یہ ہے کہ مریض کی جان لینے کے لیے کوئی عملی تدبیر نہیں کی جاتی بلکہ اسے زندہ رکھنے کے لیے جو ضروری علاج کیا جانا چاہئے وہ نہیں کیا جاتا اور اس طرح وہ مریض مر جاتا ہے، مثلاً ایسے بچے جو شدید طور پر معذور ہوں، مثلاً ان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی خرابی ہو جس کی وجہ سے ٹانگیں مفلوج ہوں یا پیشاب، پاخانہ پر قابو باقی نہ رہا ہو، یا بچہ کا دماغ پیدائش کے وقت مجروح ہو چکا ہو ایسی حالت میں زندگی بھر یہ مریض بارِ گراں بن کر زندہ رہے گا، اب اگر ایسے بچوں کو نمونیہ یا کوئی دوسرا قابل علاج مرض پیدا ہو جائے تو ان کا علاج نہ کر کے انہیں ایسی گراں بار اور تکلیف دہ زندگی سے جلد نجات دلانے کی صورت اختیار کرنا یا بوڑھے لوگ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہو جائیں اور ان کا علاج بہت گراں ہو تو آج مغربی سماج میں ایک فکر یہ پنپ رہی ہے کہ ایسے لوگوں کے علاج پر پیسے خرچ نہیں کئے جائیں، چنانچہ ان کا علاج نہیں کیا جاتا۔

ذیل میں بالترتیب یوتھینز یا کی دونوں قسموں پر فقہی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے، ایکٹیو یوتھینز یا میں مریض کو موت کے منہ میں ڈھکیلنے کے لیے ضرورت سے زائد دوا عمداً دی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ دوا کی یہ زائد مقدار اس کے حق میں مضر اور زہر کا کام کرنے والی ہے اور

شریعت نے ضرر رساں اور زہر آلود، مادوں کے استعمال سے سخت ممانعت کی ہے، سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ اپنے جانوں کو قتل مت کرو، سورۂ بقرہ میں ہے: اپنے ہاتھوں سے خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو، زہر کھا کر خودکشی کرنے والے کے لیے نبی کریم ﷺ نے جہنم کی وعید سنائی (مسلم شریف، الفتح: ۱/۲۶۵) زہر آلود دواؤں کے بارے میں فقہاء کا کہنا ہے کہ اگر ان کے استعمال کرنے سے عموماً موت یا جنون لاحق ہوجاتا ہے تو ان کا پینا جائز نہیں۔

الادوية السامة قال الحنابلة فى الاصح مافيه السموم من الادوية ان كان الغالب من شربه واستعماله الهلاك به أوالجنون لم يبح شربه (الفقه الاسلامى و ادلته: ۴/۲۶۲۶) مسموم وزہرالود دواؤں کے بارے میں حنابلہ کا صحیح ترین قول یہ ہے کہ اگر ان کے نوش واستعمال سے ہلاکت یا جنون غالب ہے تو ان کا پینا مباح نہیں ہے۔

واما الضار فلايحل اكله كالسم والمخاط والمنى والتراب والحجر لقوله تعالىٰ ولاتقتلوا انفسكم (انساء: ۴/ ۲۹) وقوله تعالىٰ ولاتلقوا بأيدكم الى التهلكة (البقرة: ۲/ ۱۹۵) وأكل هذه الاشياء تهلكة فوجب ألاتحل (الفقه الاسلامى و ادلته: ۴/ ۲۵۹۲) بہرِحال نقصاندہ اشیاء تو ان کا کھانا حلال نہیں ہے جیسے زہر، رینٹ، منی، مٹی، پتھر وغیرہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، نیز ارشاد ہے: تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور ان اشیاء کو کھانا ہلاکت کے مترادف ہے، پس ضروری ہوا کہ یہ حلال نہ ہوں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نوراللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں:

التداوى بما يخاف منه (من الموت) فهو ملحق بالسم فما هوحكم السمّ هوحكمهاى الجواز حين ينفع ولايضره وعدم الجواز اذا كان مضرا غير نافع (الابواب والتراجمء ۶/ ۲۹) اسی دوا کو بطورِ علاج استعمال کرنا جس سے موت کا اندیشہ ہو تو وہ بھی زہر کے ساتھ ملحق ہے جو حکم زہر کا ہے وہی ایسی دوا کا ہے یعنی نفع بخش اور بے ضرر ہو تو ایسی دوا کا استعمال جائز اور نقصاندہ اور غیر نفع بخش ہے تو اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

ایسے ہی زہر کا خود استعمال کرنے کے بجائے، کسی اور کو زہر دے کر مار دینا بھی شریعت میں سخت ممنوع اور گناہِ کبیرہ ہے بلکہ قتل کے حکم میں ہے، زہر دے کر کسی کو مار دینا احناف کے یہاں موجبِ دیت ہے اور متاخرینِ احناف نے فسادِ زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے قصاص لینے کا فتویٰ دیا ہے۔

واذاسقی رجلا سما فمات من ذلک فان أوجره ایجارا علی کره منه...... فلاقصاص علیه وعلی عاقلته الدیة (عالمگیری:۶/۶) جب کوئی آدمی کسی کو زہر پلا دے جس سے اس کی موت واقع ہوگئی تو اگر اس آدمی نے زبردستی اس کو زہر پلایا ہے تو اس پر قصاص نہیں، ہاں اس کے عاقلہ پر دیت لازم ہے، **وقدصرحوا بأن سقی السم موجب للقصاص خلافا لظاهر الروایة وعملوا بهذه الروایة نظرا الی فسادالزمان قال الرافعی: والعمل علی هذه الروایة فی زماننا لانه ساع فی الارض بالفساد فیقتل دفعا لشره، راجع التریر المختار: ۲/۳۲۳، فصل فیما یجب القود (تکمله فتح الملهم: ۲/۳۳۸)** فقہاء نے ظاہر الروایۃ کے برخلاف زہر پلانے پر قصاص کے واجب ہونے کی تصریح کی ہے اور انہوں نے فسادِ زمانہ کے پیشِ نظر اس پر عمل کیا ہے علامہ رافعی فرماتے ہیں: ہمارے زمانہ میں اسی روایت پر عمل ہے، اس لیے کہ ایسا آدمی دراصل زمین میں فساد مچانے والا ہے لہٰذا اس کے شر و فساد کو ختم کرنے کے لیے اسے قتل کیا جائے گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ مسلم شریف کی اپنی عظیم شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

أفتی المتاخرون من الحنیفة فی هذه المسئلة بقول الجمهور دفعا لشرّ المتمردین (تکمله فتح الملهم: ۴/۳۱۱) متاخرین حنفیہ نے اس مسئلہ میں جمہور ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے، سرکشوں کے شر کے خاتمہ کے مقصد سے، اس لیے ایکٹیو یوتھینیز یا کا مروجہ طریقۂ کار، معنی و مفہوم اور مآل کے اعتبار سے بذریعۂ زہر قتل کے حکم میں ہے، ان دونوں کے درمیان، بظاہر اگر کچھ فرق ہے تو وہ اندرونی داعیہ اور جذبے کا ہے بذریعۂ زہر قتل میں زہر دینے والے کا مقصد عموماً انتقام لینا ہوتا ہے اور یہاں زائد مہلک دوا

دینے والوں کا منشا اگر چہ مریض کو راحت پہنچانا اور اس پر شفقت کرنا ہوتا ہے لیکن انجام بہرِ حال دونوں مقاصد کا ایک ہی ہے یعنی موت کا معاملہ اپنے اختیار میں لینا، جو کسی طرح اسلام میں درست نہیں ہے۔

یوتھینز یا کی دوسری قسم Passive یعنی غیر عملی یوتھینز یا ہے، اس کا حاصل ترکِ علاج اور ترکِ تداوی ہے، اس میں شک نہیں کہ تمام فقہاء اسلام اور محدثین عظام نے دوا وعلاج کو زیادہ سے زیادہ مباح یا مندوب قرار دیا ہے، اس سے بڑھ کر حیثیت نہیں دی، تاہم یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ موجودہ دور کی طب اور پچھلے زمانوں کی طب میں حیرت انگیز انقلاب اور تبدیلی رونما ہو چکی ہے پچھلے ادوار کی طب کا زیادہ تر مدار، محدود تجربوں پر اور زبانی نسخوں پر ہوا کرتا تھا۔

اسی بناء پر پچھلے زمانوں میں دوا اور علاج سے شفاء کی امید اور ناامیدی کا تناسب یا تو مساوی ہوتا یا ان کے درمیان کوئی قابل لحاظ فرق نہ ہوتا اسی لیے اس زمانے کے فقہاء نے بھی دوا وعلاج کی اس عمومی تاثیر کو مدنظر رکھتے ہوئے حفاظتِ جان کے معاملہ میں اس کو محض ایک ظنی ذریعہ قرار دیا اور یہ بھی صراحت کی کہ ترکِ تداوی کی بناء پر کسی کی موت واقع ہو جائے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا، (شامی: ۵/ ۸۷۵) مگر اب جب کہ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے اور طب کے میدان میں بے انتہا ترقی کر چکی ہے تو بہت سے امراض کی بابت، علاج ومعالجہ کی وہ نوعیت نہیں رہی جو سابق میں تھی، آج بہت سارے امور حقیقت بن کر سامنے آرہے ہیں مثال کے طور پر عزالدین ابن عبدالسلام کا یہ فتویٰ کہ اگر کسی شخص کا جسم کا کوئی حصہ سڑ گل رہا ہے اور خطرہ ہے کہ اگر اسے کاٹا نہیں گیا تو جان چلی جائے گی تو جان کی حفاظت کے لیے اس کے ہاتھ کا کاٹا جانا برداشت کیا جائے گا، بشرطیکہ غالب ظن یہ ہو کہ ہاتھ کاٹ دینے سے جان بچ جائے گی (قواعد الاحکام: ۷۸)

غور کیجئے کہ سرجری Surgery کا موجودہ محفوظ طریقہ اس حقیقت کو کس طرح لفظ بہ لفظ پورا کر رہا ہے اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے فقہی حیثیت سے موجودہ دور کی طب پر علی الاطلاق آنکھ بند کر کے گذشتہ ادوار کی طب کے احکام منطبق کرنا درست نہیں، سابق میں

بھی فقہاء نے دوا کے استعمال پر شفا کے یقینی اور ظن غالب ہونے کی صورت میں ترکِ تداوی کو گناہ اور معصیت قرار دیا ہے، امام غزالیؒ فرماتے ہیں: **ان المریض لو علم بالقطع الشفاء ثم لم یداویه فهو عاص مثل الجائع الذی عنده طعام ولو کان الشفاء مظنونا فی حدالجواز ولو کان موهوما فترک ذلک الدواء احسن وهو توکل (العرف الشذی علی هامش الترمذی: ۲/۲۴)** امام غزالیؒ کی اس چشم کشا تحریر سے یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ فقہاء نے دوا وعلاج کی جس قسم کو مباح قرار دیا ہے وہ معالجہ کی وہ نوع ہے جس میں شفاء کا حصول محض ظنی ہو لیکن جس میں شفاء کا حصول یقینی یا ظن غالب کے درجہ میں ہو تو وہاں ان فقہاء کے مطابق بھی دوا کا استعمال ایسا ہی ضروری ہے جیسے بھوک کے لیے غذا کا استعمال، اگر کوئی اس صورت میں دوا کا استعمال نہیں کرے گا تو ہو گنہگار ہوگا۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ تحریر فرماتے ہیں: اگر صورتحال ایسی ہو جائے کہ انسانی علم وتجربہ کے مطابق دوا کا استعمال جان بچانے کے لیے ضروری ہو جائے تو بالکل جس طرح غذا کے ترک پر گنہگار ہونا مسلم ہے اسی طرح ترکِ دوا پر گناہ گار ہونا لازم ہوگا، اس سلسلہ میں جن فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ:

دوا سے شفاء یقینی نہیں اور غذا سے جان کی حفاظت یقینی ہے، انہوں نے اس نتیجہ تک پہونچنے میں تجربہ ہی سے کام لیا ہے اور تحری واجتہاد اور استقراء وتجربہ ہی اس رائے کی بنیاد ہیں لہٰذا اگر کسی وقت صورتحال ایسی ہو کہ خود مبتلی بہ یعنی مریض یا ڈاکٹر اس نتیجہ تک پہونچیں کہ اگر فلاں دوا نہیں کھائی یا فلاں دوا اس مریض کو نہیں کھلائی گئی تو اس کی موت یقین ہے، ایسی صورتِ حال میں دوا کا استعمال واجب ہوگا اور دوا کا ترک گناہ۔

زمانۂ رسالت میں بھی بعض ان دواؤں کا یا طریقۂ معالجہ کا خاص اہتمام تھا، جن کی تاثیر صحت کی برقراری میں پانی اور غذا کے مانند تھی، اس خصوص میں حجامت یعنی سینگی لگوانے کے طریقۂ علاج کو ذکر کیا جا سکتا ہے، عربوں کی گرم مزاجی کے پیشِ نظر یہ طریقۂ علاج خاصا مفید تھا، اس لیے خود نبی اکرم ﷺ بھی اس کا خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے، اس ذریعہ علاج

کی افادیت کو بڑھانے کی غرض سے آپؐ نے مخصوص ایام کی نشاندہی بھی فرمائی ہے، نیز معراج کی رات، جب کبھی آپ ﷺ کا فرشتوں کی کسی جماعت پر سے گذر ہوتا تو وہ آپ ﷺ کو حکم دیتے کہ اپنی امت کو حکم کیجئے کہ وہ حجامت کو لازم پکڑیں (ترمذی:۲/۲۵)

ان تفصیلات کی روشنی میں غیر عملی یوتھینز یا (ترک علاج ومعالجہ) کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی قباحت اگرچہ عملی یوتھینز یا کے مساوی نہیں لیکن بہرِحال غیر عملی یوتھینز یا بھی معصیت سے خالی نہیں خاص طور پر جب کہ اس میں ترکِ تداوی، بغرضِ اہلاک (مارنے) یا برائے موت ہے، علامہ ابن الجوزیؒ نے تلبیس ابلیس میں صاف لکھا ہے کہ جس طرح اپنے آپ کو بالقصد ہلاک کرنا معصیت ہے، اسی طرح اپنے آپ کو ہلاکت کے منہ میں جھونکنا اور ہلاکت کے راستہ پر ڈالنا بھی معصیت ہے (تلبیس ابلیس: ۲۸۷، ۳۰۰، ۳۵۹)

خلاصہ یہ ہے کہ یوتھینز یا کی دو قسمیں اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہیں۔

معذورین کے حقوق ومراعات: اسلامی نقطہ نظر

انسانی معاشرے کا وہ حصہ جسے مادہ پرستی کے اس دور میں نظر انداز کردیا گیا ہے، معذورین کے عنوان سے جانا جاتا ہے، سماج کے اس طبقہ میں وہ افراد شامل سمجھے جاتے ہیں، جو رفتارِ زمانہ اور زندگی کی دوڑ میں اپنی طبعی دائمی اور پیدائشی مجبوریوں کی بناء پر پیچھے رہ گئے ہوں، بینائی شنوائی سے محروم، بے دست وپا دماغی طور پر مفلوج، دائمی روگ میں مبتلا افراد عام طور پر اس میں داخل مانے جاتے ہیں۔

یوں تو دنیا بھر میں ان کے تعلق سے ہمدردی کی لہر چل پڑی ہے، ایک عالمی ادارہ باقاعدہ طور پر ان کا نگران سمجھا جاتا ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ سماج کا یہ طبقہ جس قدر ہمدردی اور توجہ کا مستحق ہے، فی الحال عملی طور پر محرومی کے شکوہ سے دوچار ہے، ان حضرات کا قضیہ وقتی عبوری اقدامات سے حل نہیں ہوجاتا، ان کے مستقل حل کے لیے مضبوط حکمتِ عملی اور بڑے دیرپا اقدامات ناگزیر ہیں، ویسے تو معذورین کے تعلق سے جذبۂ ترحم انسانی فطرت کا تقاضا اور لازمہ ہے لیکن اسلام نے اس جذبہ کو صحیح رخ دیا ہے، معذورین کے مختلف حقوق ومراعات وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں، قانونِ اسلامی کا ایک معتد بہ حصہ ان کے حقوق سے متعلق مختص کردیا گیا ہے، ذیل میں اسلامی نقطۂ نظر سے معذورین کے معاشی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی وحربی حقوق ومراعات پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے۔

معاشی حقوق ومراعات: اسلام نے معذور افراد پر کسی طرح کا معاشی بار نہیں رکھا ہے، کسبِ معاش کی الجھنوں سے انہیں آزاد رکھا ہے، وہ تمام قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ جن میں کمزوروں، بے سہاروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان پر انفاق کی تلقین کی گئی ہے، معذورین بھی ان کے مفہوم میں داخل ہیں، کتبِ فقہ میں نفقۂ اقارب کے عنوان سے جو تفصیلات بکھری پڑی ہیں؛ ان کا حاصل بھی یہی ہے کہ ان معذورین کے معاش وزیست میں

تعاون ہو، علامہ کاسانی رحمہ اللہ نفقۂ اقارب کے وجوب (بعض رشتہ داروں کے نفقہ کا بعض رشتہ داروں پر وجوب) کی ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی شرط کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خاندان کے کچھ مفلس رشتہ دار، اپاہج ولاچار ہوں یا معذور ومفلوج ہوں یا جنون واندھے پن کا شکا ہوں، دست وپا بریدہ یا شل زدہ ہوں تو ان کا نفقہ معہود ترتیبِ فقہی کے اعتبار سے خاندان کے دیگر صحیح الاعضاء متمول رشتہ داروں پر واجب ہوتا ہے'' (ملاحظہ ہو، بدائع الصنائع: ۴۴۶/۴) معذورین کے حقوق کی یہ رعایت خاندانی سطح سے تھی، اسلامی دورِ درخشاں میں حکومتی سطح پر معذورین کی نگرانی اور دیکھ بھال کا جو نظم تھا وہ حد درجہ بے مثال اور قابلِ رشک تھا۔

علامہ شبلی الفاروق میں لکھتے ہیں: (حضرت عمرؓ کے زمانے میں) عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک کے جس قدر اپاہج، از کارِ رفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں، لاکھوں سے متجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی، بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے مقرر کر دیئے جائیں (الفاروق: ۱۹۶/۲، ۱۹۷) غرض حکومتی سطح پر جو معاشی مراعات مسلم معذورین کو حاصل تھیں، پوری رواداری کے ساتھ غیر مسلم معذور رعایا بھی نفع اندوز ہوتی تھی، ایک اور مقام پر علامہ موصوف رقمطراز ہیں:

یہ جو قاعدہ تھا کہ جو مسلمان اپاہج اور ضعیف ہو جاتا تھا اور محنت ومزدوری سے معاش نہیں پیدا کر سکتا تھا، بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا، اسی قسم کی بلکہ اس سے زیادہ فیاضانہ رعایت ذمیوں کے ساتھ بھی مرعی تھی (الفاروق: ۱۵۷/۲)

سید قطب شہید مرحوم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے نابینا کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے، آپؓ نے اس سے پوچھا: تمھیں کس چیز نے اس حالت تک پہنچایا؟ اس نے جواب دیا: جزیہ، ضرورت اور بڑھاپا، عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے

گئے اور اتنا کچھ دیا جو اس وقت کی ضروریات کے لیے کافی تھا، پھر آپؓ نے بیت المال کے خزانچی کو کہلا بھیجا کہ اس شخص اور اس جیسے دوسرے اشخاص کی طرف توجہ کرو، خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم اس کی جوانی کی کمائی کھائیں اور بڑھاپے میں اسے دھتکار دیں...... آپؓ نے اس فرد اور اس جیسے دوسرے افراد کو جزیہ سے بری قرار دے دیا، جب آپؓ نے دمشق کا سفر کیا تو ایک ایسی بستی سے گذرے جہاں کچھ جذام کے مریض عیسائی بستے تھے، آپؓ نے حکم دیا کہ ان کو زکوٰۃ کی مد سے امداد دی جائے اور ان کے لیے راشن جاری کیے جائیں (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام اردو: ۳۷۸) ایک صحابیؓ جن کی بینائی میں نقص تھا اور کچھ ذہن بھی متاثر تھا وہ خرید وفروخت میں اکثر دھوکا کھا جاتے تھے، آپ ﷺ نے ان کی اور ان جیسے افراد کی خاطر، خرید وفروخت میں خیارِ شرط مشروع فرمایا، جس کی رو سے بیچنے والے یا خریدنے والے کو بیع کی قطعیت کے لیے تین دن کی مہلت مل جاتی ہے (ملاحظہ ہو: **تکمہ فتح الملهم: ۳۷۸/۱، ۳۸۲**)

معاشرتی حقوق ومراعات: اسلام نے معذور افراد کو الگ تھلگ کسمپرسی کی زندگی گذارنے کے بجائے اجتماعی معاشرت کا حوصلہ دیا، ان کے مقام ومرتبہ کے مناسب معاشرتی کام بھی تفویض کیے، احساسِ کمتری اور معاشرتی سردمہری کا شکار بننے سے ان کو تحفظ فراہم کیا، عبداللہ بن ام مکتومؓ ایک نابینا صحابیؓ تھے ایک دفعہ وہ بغرضِ دریافت مسئلہ بارگاہِ اقدس ﷺ میں ایک ایسے وقت حاضر ہوئے جب کہ آپ ﷺ بعض اعیانِ قریش سے اسلام پر گفتگو فرما رہے تھے، آپ ﷺ کو ان کا یہ بے وقت سوال پوچھنا ناگوار ہوا، بس اتنا ہونا تھا کہ سورۂ عبس کا نزول ہوا، جس میں آپ ﷺ پر اس رویہ کے تعلق سے ہلکا سا عتاب کیا گیا روایات میں ہے کہ اس کے بعد جب وہ نابینا آپ ﷺ کی خدمت میں آتے تو آپ ﷺ بہت تعظیم وتکریم سے پیش آتے اور فرماتے: خوش آمدید اے وہ ساتھی جس کے بارے میں پروردگار نے مجھ پر تنبہ فرمایا۔

رسولِ پاک ﷺ جب غزوۂ احد کے لیے روانہ ہوئے تو اپنی جگہ انہی نابینا ابن ام مکتوم کو اپنا نائب فرمایا (**السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: ۱۷/۳**) غور کیجئے کتنا بڑا منصب

ایک نابینا شخصیت کے سپرد کیا جارہا ہے اورتو اور ایک جذامی آدمی کو بھی آپؐ نے اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرمایا ہے(**تکملۂ فتح الملھم: ۳۷۲/۴، نزھة النظر فی توضیح نخبة الفکر**: ۴۵) سعید بن یربوع ایک صحابیؓ تھے جن کی آنکھیں جاتی رہی تھی، حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ آپ جمعہ میں کیوں نہیں آتے انھوں نے کہا: میرے پاس آدمی نہیں کہ مجھ کو راستہ بتائے، حضرت عمرؓ نے ایک آدمی مقرر کردیا جو ان کے ساتھ رہتا تھا (الفاروق:۲۰۵/۲) حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانے میں حضرت عمرؓ مدینہ کی ایک اندھی عورت کی خبر گیری کیا کرتے تھے، پھر ایسا ہونے لگا کہ جب بھی آپ پہنچتے یہ دیکھتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ آکر اس کے کام کرجاتے ہیں (اسلام میں عدل اجتماعی قطب شہیدؒ:۳۸۶)

مذہبی حقوق ومراعات: بہت سی وہ عبادات جو جسمانی تعب ومشقت کی متقاضی ہیں، اسلام نے معذور حضرات کو یا تو ان سے بالکلیہ مستثنیٰ رکھا ہے یا پھر ان کا متبادل تجویز کیا ہے، جمعہ وجماعات کی لازمی حاضری سے معذور حضرات مستثنیٰ ہیں، مالدار ہوں مگر اپاہج ولاچار ہوں تو عبادتِ حج میں، حج بدل اور روزہ میں فدیہ کی شکل رکھی گئی ہے، جہاد جیسی عظیم عبادت سے بھی یہ حضرات مستثنیٰ رکھے گئے ہیں، ارشادِ باری ہے: اندھے پر کوئی حرج نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے (سورۂ فتح:۱۷) تشریحی نوٹ ملاحظ ہو: بصارت سے محرومی اور لنگڑے پن کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذوری ہے یہ دونوں عذر تو لازمی ہیں، ان اصحابِ عذر یا ان جیسے دیگر معذورین کو جہاد سے مستثنیٰ کردیا گیا، حد تو یہ کہ یہ معذور حضرات جو اپنی معذوری کے سبب جہاد سے پیچھے رہ گئے ان کے لیے بھی مجاہدین کے برابر اجروثواب کا وعدہ گھر بیٹھے حاصل ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذورین کے بارے میں جہاد میں شریک لوگوں سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ تمہارے پیچھے مدینہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم جس وادی کو بھی طے کرتے ہو اور جس راستے پر بھی چلتے ہو تمہارے ساتھ وہ اجر میں برابر کے شریک ہیں، صحابہ کرامؓ نے پوچھا یہ کیوں کر ہوسکتا ہے جب کہ وہ مدینہ میں بیٹھے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **حبسھم العذر** عذر نے ان کو وہاں روک دیا ہے (بخاری شریف: کتاب الجہاد)

سیاسی وحربی حقوق ومراعات: اسلام سے قبل جنگ میں مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا، دشمن قوم کے ہر فرد کو دشمن سمجھا جاتا تھا اور اعمالِ جنگ کا دائرہ تمام طبقوں اور جماعتوں پر یکساں محیط تھا، عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی کوئی بھی اس ہمہ گیر دست درازی سے مستثنٰی نہ تھا (الجہاد فی الاسلام: ۱۹۸) اسلام نے اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ کی کہ محاربین (Belligerents) کو دوطبقوں میں تقسیم کردیا، ایک اہل قتال (Combatants) دوسرے غیر اہلِ قتال (Non Combatants) اہل قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں یا عقلاً وعرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں یعنی جوان مرد اور غیر اہلِ قتال وہ ہیں جو عقلاً وعرفاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے یا عموماً نہیں لیا کرتے مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضاء، مجنون، سیاح، خانقاہ نشین زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ، اسلام نے طبقۂ اوّل کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے اور طبقۂ دوم کے لوگوں کو قتل کرنے سے منع کردیا ہے (الجہاد فی الاسلام: ۲۲۳)

آج معذورین کے حقوق کے علمبردار اور دعویدار طاقتیں اپنی طاقت کے نشہ میں نہ صرف معذورین سمیت بستی کی بستی اور ملک کے ملک اجاڑ رہی ہیں بلکہ ہلاکت خیز کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کے ذریعہ نسلوں، معذورین کی افزائش وآبادی میں اضافہ کا سامان بہم پہنچا رہی ہیں، ناطقہ سربگریباں اور خرد معرکۂ حیرت بنی ہوئی ہے کہ ان کے قول وعمل کے اس تفاوت وتضاد کی آخر کیا توجیہ کی جائے۔

اس کائناتِ ارضی وسماوی میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کی تعلیمات وہدایات تضاد ونفاق کے جراثیم سے مطلق پاک ہیں اور اسلام ہی روئے زمین پر وہ اکیلا مذہب ہے جو معذورین سمیت پوری انسانیت کا مسیحا ہے، البتہ شرط ہے اس کے نظام کو اپنانے اور برتنے کی ہے۔

عہدے کی نزاکت سے غفلت

عہدہ ومنصب کا عنوان انسانوں کے عرف میں شخصی بالادستی اور ایک خاص برتری کی نمائندگی کرتا ہے، حاملِ عہدہ کو ایک متعین دائرہ میں خصوصی اختیارات حاصل ہوتے ہیں،عہدہ کے کچھ تقاضے اور کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں،جن کو بخوبی نبھانا منصب کی خیریت کی دلیل تسلیم کی گئی ہے،'جب کہ اختیارات کا غلط استعمال آدمی کی خاموش تباہی (ذبح بغیر سکین) قرار دی گئی ہے.' تاہم ذمہ داریوں سے سلامتی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا بھی کوئی کم جوکھم کا کام نہیں، کانٹوں کی گذرگاہ عبور کرنے کے مترادف ہے، بہت کم خوش نصیب ہوتے ہیں، جو دامن بچا کر گزرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، بیشتر افراد تو راستہ ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے چونکہ حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ بھی دین سے الگ نہیں ؛اسلئے اسلام نے عہدہ ومنصب کو دینی رخ دیا ہے اور اس خصوص میں واضح ہدایات اور کئی ایک رہنمایانہ خطوط وضع کئے ہیں۔

عہدہ ذمہ داری یا حق

اول تو اسلام نے عہدہ واختیار کو ایک بارِگراں اور نازک ذمہ داری خیال کیا ہے، نہ کہ مرغوب حق ،ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے آپ ﷺ سے منصب کی درخوست کی ،تو آپ ﷺ نے انکے شانہ پر اپنا دستِ مبارک مارا، پھر فرمایا: اے ابوذرؓ! تم ضعیف آدمی ہو،تم سے منصب کا بوجھ نہیں اٹھ سکے گا، عہدہ ومنصب تو ایک امانت ہے، اور کل قیامت کے دن رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہے، اِلّا یہ کہ کسی نے بجا طور پر اسے حاصل کیا ہو اور اسکے حقوق ادا کردیے ہوں (مسلم شریف: کتاب الامارۃ: ۱۸۲۵)

ایک اور موقع پر، آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ ہی سے فرمایا تھا: اے ابوذر میں تمہیں ضعیف دیکھتا ہوں، جو میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں، وہی تمہارے لئے بھی پسند کرتا ہوں، نہ

تم کسی دو پر امیر بنو، نہ کسی یتیم کے مال کی ذمہ داری لو (حوالۂ سابق) جس وقت تیسری دفعہ امام ابوحنیفہؒ کو عہدۂ قضا کی پیش کش کی گئی تو امام صاحب نے امام ابویوسفؒ سے مشورہ کیا تھا، امام ابویوسفؒ نے رائے ظاہر کی کہ اگر آپ قبول فرمالیں تو لوگوں کو نفع ہو، اس پر امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ کو غضبناک نگاہوں سے دیکھا، تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر مجھ کو بحرِ ذخار کی شناوری کرنے کا یا تیر کر سمندر کے عبور کرنے کا حکم دیا جائے تو کیا یہ مجھ سے ممکن ہو سکتا ہے؟ (تکملۃ فتح الملہم ۲/۵۳۶)

عہدہ طلبی

یوں تو وہ عہدے و مناصب جن سے ملّی امور وابستہ ہیں، ان کی جگہ پُر کرنا، امت کے لائق و اہل حضرات کے ذمہ فرضِ کفایہ ہے؛ لیکن ان عہدوں کی طلب میں نامناسب مسابقت اور بے جھجک آمادگی درحقیقت عہدوں کی نزاکتوں سے صرف نظری کے مماثل ہے، منصب داری گویا پُل صراط کا راستہ ہے، معمولی لغزش بھی بسا اوقات جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو کوئی حاکم مسلمانوں کے امور کا نگران مقرر ہو، پھر وہ ان کے لئے وقف نہ ہو جائے اور ان کے حق میں خیر خواہی نہ کرے، تو وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہوگا (مسلم: کتاب الامارۃ) وہ عامل جو مالیہ میں بے ضرورت اور غیر محتاط تصرف کرتا ہے، اسے آپ ﷺ نے خائن اور چور قرار دیا ہے (کنز العمال ۶/۷۸) عہدہ کا بے حجابانہ مطالبہ اور شدید خواہش، چوں کہ عام طور پر طالب کی بے باکانہ طبیعت کی نشاندہی کرتا ہے؛ اس لئے نہ طالبِ عہدہ کو عہدہ کی حوالگی، قرینِ مصلحت سمجھی گئی اور نہ اس طلب کی حوصلہ افزائی کی گئی؛ بلکہ کرسی کی ہوس کو آدمی کی خیانت کے بجائے باور کرلیا گیا ہے، ارشادِ گرامی ہے: تم میں سب سے بڑھ کر خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو اسے خود طلب کرے (ابوداؤد: کتاب الامارۃ) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے دو چچازاد بھائیوں کے ہمراہ آپ ﷺ کی خدمت میں پہونچا، میرے دونوں بھائیوں نے یکے بعد دیگرے آپ ﷺ سے عہدیداری کی خواہش ظاہر کی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم عہدہ اس آدمی کے سپرد نہیں کرتے جو اسے مانگتا ہو اور اس کی حرص رکھتا ہو (مسلم شریف: کتاب الامارۃ)

علماء نے تصریح کی ہے کہ امارۃ وعہدہ کی طلب کا منشا اگر حبِّ مال ہے تو وہ سخت ممنوع ہے؛اس لئے کہ یہ دنیا طلبی ہے، دینداری نہیں اور اگر عہدہ طلبی کا محرک دنیاوی منفعت نہ ہو؛ بلکہ اصلاحِ امت، قیامِ امن وانصاف اور حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہو،تو عہدہ کا مطالبہ ممنوع نہیں، تاہم عادۃً اور غالباًچوں کہ عہدہ طلبی، اول الذکرمحرک ہی کی بنا پر ہوتی ہے،عموماً آدمی عجب وپنداراور پدرم سلطان بود، کے زعم ہی میں منصب کا خواہش مند ہوتا ہے؛اس لئے آپ ﷺ نے عہدہ کی طلب، چاہت اور حرص سے منع فرمادیا اور وقتِ ضرورت بادلِ ناخواستہ اس راہ کواختیار کرنے کی تلقین فرمائی (اعلاء السنن ۱۵/۴۴) اس اسلامی مزاج کے پیشِ نظر آدمی کا عہدوں کے حصول کے لئے اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا سِرے سے غیر آئینی قرار پاتا ہے،حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کی تصریح کے مطابق جمہوری نظام میں مختلف لیڈرانِ قوم کا عہدہ ومنصب کے لئے ازخود اپنے آپ کو نامزد کرلینا اوراپنی کامیابی کے لئے قوم سے ووٹوں کا مطالبہ کرنا، یہ طرزِ عمل بھی کھلے طور پر، حبِّ جاہ حبِّ مال اور دیگر مفاسد کا آئینہ دار ہونے کی وجہ سے صد فیصد غیر اسلامی ہے۔(تکملۃ فتح الملہم ۳/۲۹۵)

عہدیدار کے اوصاف

ویسے تو عہدیدار کے اندر کئی ایک اوصاف مطلوب ہیں،مگر جو وصف قابلِ ذکراور قدرِ مشترک کے طور پر ہر حاملِ عہدہ میں ملحوظ ہے، وہ وصفِ عدالت یعنی دیانت داری اور بلند اخلاقی کا وصف ہے، عہدیدار زبان کا سچا ہو، امانت دار ہو، محرّماتِ شرعیہ سے بچتا ہو، گناہوں سے دور ہو،محتاط رہتا ہو، اپنے دین ودنیاوی امور میں اعلیٰ ظرف واقع ہوا ہو (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۸/۶۱۷۹)

زمانہ حال میں عہدہ کی درگت

موجودہ زمانہ میں تقریباً عہدہ کے تعلق سے ذمہ داری ہونے کا احساس بھی رخصت ہوا اورعہدہ طلبی میں دیانت واخلاص کا بھی فقدان ہوگیا،اب عہدہ گویا پیدائشی حق تصور کرلیا گیا ہے،شہرت وجاہ طلبی کا سَستا ذریعہ خیال کرلیا گیا ہے اور مالی حیثیت سے عہدہ ومنصب کے حصول میں کی جانے والی تگ ودو، لاٹری کے مترادف ہوکر رہ گئی ہے، عہدوں کے حصول

میں ہونے والی دوڑ دھوپ انتہائی مکروہ شکل اختیار کرگئی ہے،ایک دوسرے کی تحقیر،سرِ بازار ناموسوں سے کھلواڑ، بدکلامی وبدگوئی، رنجش وحسد، رائے وتائید کی سودے بازی وغیرہ،عہدہ طلبی کی دوڑ کے لوازمات بن چکے ہیں،عہدوں کو خانگیانے کا بھی ایک عجیب رواج چل پڑا ہے،عہدہ کوایک ایسی غیر مختتم میراث فرض کرلیا گیا ہے جوکسی خاندان میں آجانے کے بعد نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آتی ہے، شورائی نظام کو پامال کرکے عہدوں کو ہتھیا لینے اور اغوا کرلینے کا ایک نہایت ہی تکلیف دہ سلسلہ چل پڑا ہے۔

عہدوں کی منتقلی اسلامی نقطۂ نظر

عہدے کا ایک انسان سے دوسرے انسان کی طرف منتقل ہونا، خاندان وقرابت کی بنا پر نہ ہو، رنگ ونسل کی بنا پر نہ ہو بلکہ لیاقت واہلیت کی بنا پر ہو،امت کے اجتماعی مفاد کے اعتبار سے ہو، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے مسلمانوں کی کسی چیز پر بھی کسی ایسے شخص کو والی وحاکم بنادیا کہ اس سے بہتر اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ فائدہ مند آدمی موجود ہے،تو اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے خیانت کی ؛ ایک اور راویت میں یہ بھی اضافہ ہے کہ ”اس نے اہلِ اسلام سے خیانت کی،“ (المستدرک حاکم: کتاب الاحکام: ۷۰۲۳) اور حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں: جس نے مسلمانوں کی کسی چیز پر کسی ایسے آدمی کو والی اور حاکم بنایا، جو اس سے مودت اور دوستی رکھتا ہے یا قرابت دار کو والی یا حاکم بنایا، تو وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں سے خیانت کرتا ہے۔ (سیاست شرعیہ از ابن تیمیہ: ۶۸)

اولاد کو عہدے ومناصب تفویض کرنا

ذیل میں پیش کی جانے والی تفصیلات کا تعلق اگر چہ براہ راست منصبِ امارت سے ہے، تاہم چوں کہ دیگر مناصب اپنے اپنے دائرہ کار میں عہدۂ امارت ہی کی فرع ہیں ؛ اس لئے فرقِ مراتب کے ساتھ وہ ساری تفصیلات ان پر بھی چسپاں رہیں گی، محقق علماء کے مطابق پیشر و امام کی جانب سے کسی اہل شخص کی نامزدگی کی حیثیت ایک تجویز جیسی ہے، جسے امت کے اربابِ حل وعقد، بعد از استصوابِ رائے برقرار بھی رکھ سکتے ہیں اور رد بھی کرسکتے ہیں ،پھر اگر ولی عہدی بیٹے یا باپ کے حق میں ہو تو علماء کی اس میں تین آراء ہیں ؛ مسلمانوں کی

تاریخ اور موروثی خلافت کے بُرے نتائج ومفاسد پر نظر رکھنے والے بالغ نظر علماء کی رائے یہ ہے کہ خلیفہ اس معاملہ میں آزاد نہیں، امت کے اہلِ حل وعقد کی منظوری ورضامندی بہرِ صورت ضروری ہے (تکملۃ فتح الملہم ۲۹۱/۳) رسول اللہ ﷺ نے اپنے پورے عہدِ حکومت میں، حضرت علیؓ کے سوا بنی ہاشم میں سے عہدہ کسی کو نہ دیا، حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے قبیلے اور خاندان کے کسی شخص کو سِرے سے کسی منصب پر مامور نہ کیا ،حضرت عمرؓ اپنے دس سال کے عہد میں بنی عدی کے صرف ایک شخص کو ایک چھوٹے سے عہدے پر مقرر کیا اور اس سے بھی ان کو بہت جلدی سبکدوش کر دیا، خلفاءِ بنو عباس میں سے کسی نے اپنے عہد کے بعض علماء سے زمانۂ سابق کے کچھ احوال معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی، اس عالم نے عمر بن عبد العزیزؒ کی سوانح چھیڑی، کہنے لگے: عمر بن عبد العزیزؒ بسترِ مرگ پر تھے، کسی نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا: آپ نے مال و دولت سے اپنی اولاد کو بالکل ہی محروم رکھا ہے، اپنے بعد انہیں فقیر و بے نوا چھوڑ دیا ہے، ان کے لئے کوئی ایسی جائیداد یں نہیں چھوڑی، جو آئندہ وقتوں میں ان کے کام آسکے، یہ سن کر حضرت عمر ثانیؒ نے اپنے بیٹوں کو طلب فرمایا، تمام حاضر ہو گئے، جو دس سے زیادہ تھے اور سب کے سب نابالغ تھے، حضرت عمرؒ ان کو دیکھ کر رونے لگے پھر ارشاد فرمایا: میرے بیٹو! جو تمہارا حق تھا، وہ میں نے تم کو پورا دیدیا ہے، کسی کو محروم نہیں رکھا اور میں لوگوں کا مال تم کو نہیں دے سکتا، تم میں سے ہر ایک کا حال یہ ہے کہ یا تو وہ صالح و نیک بخت ہوگا یا غیر صالح ہوگا، اگر وہ صالح ہوگا، تو خدا صالح و نیک بند وں کا نگہبان و مددگار رہتا ہے اور اگر غیر صالح ہوگا تو میں اس کے لیے مال چھوڑ کر اس کی معصیت کے فروغ کا موقع ایک لمحہ کے لئے بھی فراہم کرنا نہیں چاہتا، بس اتنا کہا اور لڑکوں کو رخصت کر دیا، وہ قصہ گو عالم کہتے ہیں کہ اقصائے مشرق، بلادِ ترک وغیرہ، اقصائے مغرب و بلادِ اندلس، جزائر، قبرص اور حدودِ شام، سب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی عمل داری میں تھے، تمام پر انکی فرمانروائی چلتی تھی، اس کے باوجود اُن کے عسرت و مسکنت کا عالم یہ تھا کہ ان کے ترکہ سے ہر لڑکے کے حق میں بمشکل ہی بیس بیس درہم بیٹھتے تھے، تاہم آگے چل کر عمر بن عبد العزیزؒ کے توکل وتفویض کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ عالمِ مذکور کا بیان ہے: میں نے خود اپنی آنکھوں

سے بعض صاحبزادوں کو مجاہدینِ اسلام کی شہسواری کے لئے سو، سو، گھوڑے اللہ کی راہ میں دیتے ہوئے دیکھا ہے، اس کے برعکس میں نے بعض ایسے خلفاء بھی دیکھے ہیں، جنھوں نے اپنا ترکہ اتنا چھوڑا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد جب لڑکوں نے باہم تقسیم کیا تو ہر ایک کے حصہ میں چھ، چھ کروڑ اشرفیاں آئی تھیں؛ لیکن میں نے ان لڑکوں میں سے بعض کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ لوگوں کے سامنے بھیک مانگا کرتے تھے، (سیاست شرعیہ:۸۸-۸۹)

بعض مؤرخین کا بیان ہے: خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ساتھ یا آٹھ بیٹوں کے لئے صرف بارہ درہم ترکہ میں چھوڑے تھے، جب کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے اپنے ہر بیٹے کے لئے ایک ایک لاکھ دینار ترکہ میں چھوڑے تھے، مگر ابھی بیس سال ہی کا عرصہ گذرا تھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے صاحبزادوں کے پاس مال و دولت اس کثرت سے اکٹھا ہو گیا کہ وہ اللہ کی راہ میں گھوڑوں پر گھوڑے صدقہ خیرات کیا کرتے تھے، جب کہ ہشام بن عبدالملک کے بیٹے، عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانے میں دارالسلام کی مسجد میں کھڑے ہو کر لوگو ل کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہوئے یہ کہتے نظر آئے کہ :من مال الله یاعبادالله : اللہ کے بندو! اللہ کی راہ میں ہمیں کچھ عطا کر دو۔ (البدایہ:۱/۶۷۶-۲۰۷۔ابن سعد۵/۳۳۰ تاریخ دمشق ۱۳۱ رسیر اعلام السنبلاء۵/۱۱۴) موجودہ دور کے عہدیداروں پر اگر عہدے کی نزاکت اور تفویض و توکل کی حقیقت کھل جائے تو عہدے کی جنگ کا خاتمہ ہی ہو جائے، یہ عہدے کی نزاکت اور منصب کی بھاری بھرکم ذمہ داری ہی کا احساس تھا، جس نے عمر بن خطابؓ جیسی دور اندیش اور محتاط شخصیت کو اپنے لائق و قابل ترین فرزند عبداللہؓ کو عہدے کے متوقع امیدواروں کی فہرست سے علیحدہ رکھنے پر مجبور کیا؛ بلکہ حضرت عمرؓ تو مودت و قرابت کی بنیاد پر عہدوں کی تقسیم کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے جناب میں اور تمام مسلمانوں کے حق میں خیانت جیسا شدید جرم قرار دیتے تھے، جمہور امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عہدہ و امارت کوئی ایسی چیز نہیں، جو خاندانی میراث بن سکتی ہو، منصب کو میراث بنا لینا غیر درست اور ناجائز عمل ہے۔

علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں: عہدوں کو اپنی آل اولاد ہی میں منحصر رکھنے کے مقصد

سے ولی عہد مقرر کرنا کوئی دینی مقصد نہیں، مناصبِ دینیہ کے ساتھ کھلواڑ ہے، (تاریخ ابن خلدون ۱/۲۶۴) علامہ ابنِ حزمؒ لکھتے ہیں: اہلِ اسلام میں سے کسی کا اس امر میں اختلاف نہیں کہ امارۃ میں میراث جاری نہیں ہوتی (الفصل فی الملل والنحل ۴/۱۶۷) حضرت علامہ مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم ایک جگہ رقم طراز ہیں: نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کو ولی عہد بنانا بھی شرعاً درست تو ہے؛ لیکن ایک طرف موضعِ تہمت ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا ہی بہتر ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا اپنے آپ کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا ہے؛ اس لئے تمام خلفائے راشدین نے اس سے پرہیز کیا، خاص طور سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تو لوگوں کے کہنے کے باوجود اپنے قابل اور لائق فرزندوں کو ولی عہد بنانے سے صاف انکار کردیا تھا (حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق: ۱۱۵) عہدوں سے متعلق اگر یہ تفصیلات پیشِ نظر رہیں تو آدمی عہدوں کے حصول کی دوڑ میں شامل ہونے سے قبل، دیانت داری کیساتھ اپنی اہلیت کا ناقدانہ جائزہ لینے پر مجبور ہوگا، موزوں شخصیات کے ہوتے ہوئے پیش قدمی کی حماقت نہیں کرے گا، بے ضمیری، غیر دانشمندی، جرأتِ بے جا کا مظاہرہ نہیں کرے گا، اس طرح عہدے اور منصب کے حوالے سے ہونے والی باہمی رسہ کشیوں، علانیہ نبرد آزمائیوں اور سرد جنگوں کا خاتمہ ہوسکے گا اور امتِ مرحومہ جو پہلے ہی اعداءِ اسلام کے متواتر حملوں سے نیم جان ہوچکی ہے، عہدوں کی داخلی انتشار سے مزید پارہ پارہ ہوجانے سے بچ جائے گی!

عالمی معاشی بحران اسباب اور حل

معاشی بحران کا مسئلہ اس وقت پوری عالمی برادری کو حیران کیا ہوا ہے، بلا تفریق ترقی یافتہ وغیر ترقی یافتہ دونوں طرح کے ممالک اس خطرے سے دوچار ہیں، دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ قیادت معاشی بحران کی بھیانک صورتِ حال سے پریشان ہوکر بے خوابی کا شکوہ کررہی ہے، تجارت، زراعت، صنعت کے شعبے عالمی سطح پر سخت متاثر ہوئے ہیں، مختلف ماہرین نے مستقبل میں مزید ابتر صورتحال کی پیش قیاسی کی ہے، اس معاشی تبدیلی نے جہاں اجتماعی طور پر کئی معیشتوں کا دیوالیہ نکالا ہے، وہیں انفرادی طور پر کئی اشخاص کی معاشی زندگی کا بھی خاتمہ کردیا ہے، بلکہ بہت سے افراد اس غیر متوقع معاشی دکھ کی تاب نہ لاکر اپنا وجود ہی ختم کر بیٹھے ہیں، ہندوستانی معیشت بھی اس معاملہ میں مستثنی نہیں ہے، ماہرین نے اس حوالے سے جو چونکادینے والے انکشافات کئے ہیں وہ بڑے ہی تشویشناک ہیں، اسوسی ایٹڈ چیمبرس(Associated Chambers) کی پیش گوئی کے مطابق صنعتی شعبے کے روزگار میں 25 تا 30 فیصد کمی آئندہ برسوں میں ہونے کا امکان ہے، کئی ایک صنعتوں میں میں 25 تا 30 فیصد کمی آئندہ برسوں میں ہونے کا امکان ہے، کئی ایک صنعتوں میں بر آمدی مصنوعات کی طلب وکھپت میں اونچا خسارہ ریکارڈ کیا گیا ہے، شئیر مارکٹ میں سرمایہ کاروں کی بھاری تعداد اس گردش سے تباہ حال ہے، معاشی ستم زدگیوں سے دلبرداشتہ، سینکڑوں سرمایہ کار خودکشی کی راہ اپنارہے ہیں، حال ہی میں مورخہ ۱۶/ نومبر ۲۰۰۸ کو ہریانہ کے ایک تاجر نے محض اس بنا پر پھانسی لے لی تھی کہ شیرز کے کاروبار میں اسے ۸۰ لاکھ روپے کا نقصان ہوگیا تھا، ہندوستان میں خودکشی کی اموات کا تناسب سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار ہے جن میں اکثر وبیشتر وارداتیں معاشی پریشانیوں کی بنا پر رونما ہوتی ہیں۔ (روزنامہ سیاست سنڈے ایڈیشن ۱۶/ نومبر ۲۰۰۸ء ٹائمس آف انڈیا ۲۱/ نومبر ۲۰۰۸ء)

اس سنگین صورتحال سے نمٹنے کے لئے مختلف آوازیں بلند ہورہی ہیں، مختلف تجاویز منظرِ عام پر آرہی ہیں، موافق ومخالف آراء ونظریات کا ایک تانتا بندھا ہے، لیکن عارف رومی کی تمثیل کی روشنی میں، یہ سارا کھیل درحقیقت اس خارزدہ گدھے کی اچھل کود کے مانند ہے جس کی غیر دانشمندانہ پیچ وتاب کی بنا پر دم میں اٹکے کانٹے کے الجھاؤ میں مزید اضافہ ہی ہورہا ہے، ضرورت ایک ایسے عقلمند کی ہے جو ذمہ داری سے کانٹے کے موقع ومحل کا جائزہ لے کر صفائی سے اسکو الگ کرلے، معاشی مسائل کے حل کی راہ میں، دنیا کے مختلف نظامہائے معیشت کا حال گدھے کی بیتابانہ جَستوں کی طرح ہے، جو انسانوں کی معاشی مشکلات کو سلجھانے کے بجائے الجھانے ہی کا سامان مہیا کررہی ہیں، اس کے برخلاف اسلام کے عطا کردہ نظامِ معیشت کی مثال اس خیر خواہ کی سی ہے جو معیشت کی راہ کے بے رحم کانٹوں کو کامیابی اور کمالِ ہوشمندی کیساتھ دور کردیتا ہے۔

ذیل میں اسلامی نقطۂ نظر سے ان عوامل اور محرکات کا جائزلیا جاتا ہے جو معاشی غیر استحکامی کے ذمہ دار ہیں, جب تک ان پر توجہ نہیں ہوگی، مسئلہ کا حل بظاہر بہت مشکل ہے۔

(ا) مادیت کا غیر معمولی غلبہ

مروجہ نظامہائے معیشت کے مدونین نے انسانوں کے ذہنوں میں یہ غلط تصور راسخ کیا ہے کہ وہ صرف اور صرف معاشی حیوان (Ecnomic Animal) ہیں جو دیگر حیوانات کے مقابلے میں نسبتاً بہتر اور منظّم انداز میں اپنی مادی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں، ظاہر ہے اس قسم کے نفسیات پیدا ہوتے ہی اخلاق واقدار کا سارا فلسفہ دماغوں سے ہَوا ہوجاتا ہے ، معیشت کی راہ میں مذہبی یا اخلاقی پابندیوں کا تصور بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے، ایسی ذہنیت کے ماحول میں ہر ایک اپنی بقا کے لئے غیر متوازن جدوجہد کرتا نظر آئے گا، ذہین اپنی ذہانت سے بے وقوف کا استحصال کرتا ہوگا، سرمایہ دار اپنے سرمایے سے غریبوں کی خون آشامی کرتا ہوگا اور طاقتور اپنے سے کمزور کو اپنا نوالہ بنارہا ہوگا، دولت کے بہاؤ میں ایک نہایت ہی بے ہنگم انقلاب رونما ہوگا، بازاروں پر ایک خاص طبقہ کی اجارہ داریاں قائم ہوں گی، طلب ورسد کے پیمانے بے اعتدالی کے شکار ہوں گے، غرض تجارت کے عنوان سے کسی بھی طرح

،خواہ وہ ذریعہ اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی ،تمدن و معاشرت کے حق میں مہلک ہو یا متصادم، دولت اکھٹا کرنے کی مکمل آزادی حاصل رہے گی۔

سرمادار یت (capitalism) جس کی کئی دہوں سے عملاً دنیا کے معاشی نظام پر حکمرانی ہے، اپنے اندر بعض معقول اور فطری اصول وقوانین رکھنے کے باوجود، محض مذہب واخلاق کی مداخلت کو نظر انداز کرنے کی بنا پر مذکورہ بالا تباہ کن نتائج سے دوچار ہو چکا ہے، ایک بالغ نظر عالمِ دین نے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب لکھا ہے:'' اعلان کردیا گیا کہ آدمی ،آدمی زادہ نہیں حیوان زادہ ہے اور اسی کو ایک فیصلے کی صورت میں قبول کرنے کے بعد، معاشی ضابطہ جو انسانوں کے لئے بنایا گیا اس کی بنیاد بھی اسی پر رکھی گئی کہ باہم انسانوں کا دوسرے انسانوں سے وہی تعلق رہے گا اور اس کو رہنا چاہئے جو دریا کی رہنے والی مچھلیوں اور جنگل باس درندوں، چرندوں وغیرہ حیوانات کے درمیان ہوتا ہے، اسی قانون کا نام تنازع للبقاء کا قانون رکھا گیا، طئے کردیا گیا کہ جیسے چھوٹی مچھلیوں کو نگلنا ہر بڑی مچھلی کا یا کمزوروں کو فنا کرکے اپنی بقا کا انتظام کرنا، جنگل کے ہر زور آور کا قدرتی حق ہے، اسی طرح آدمی بھی جب آدمی نہیں بلکہ اس قسم کا دریائی یا صحرائی حیوانوں میں سے ایک حیوان ہے تو تنازع للبقاء کی جدوجہد میں اس کو آزاد ہونا چاہیئے ،معاشی دائروں میں دریا اور جنگل کے اسی قانون کی تعبیر ''سرمایہ داری کے نظام'' سے کی گئی۔(اسلامی معاشیات:۹٦)اسلام نے تنازع للبقاء کے بجائے توافق للبقاء کے ایثارانہ وہمدردانہ قانون کی وکالت کی ہے، جس میں ہر ایک اپنی بقاء کے لئے دوسرے پر حملہ آور ہونے کے بجائے شریفانہ طور پر باہمی مصالحت بلکہ ایک گونہ ایثار سے اپنی ضروریات کی تکمیل کی راہ نکالے، اسلامی زاویۂ نگاہ سے مساعی وجدوجہد کے صرف کرنے کا اصل میدان فنا کی یہ عرصہ گاہ دنیا نہیں بلکہ بقاء کی دائمی فرودگاہ وقرارگاہ آخرت ہے۔

مذکورہ الصدر عامل ہی مروجہ نظامہائے معیشت اور اسلامی نظامِ معیشت کے درمیان اصل نقطۂ انحراف ہے، باقی امور درحقیقت اسی اولین عامل کے پیدا کردہ ہیں۔

(۲) سود کا بے تحاشہ پھیلاؤ

سود کا عنصر موجودہ معیشتوں کے گویا اجزائے ترکیبیہ میں داخل ہے، زمین کے لئے لگان، سرمایہ کیلئے سود، محنت کے لئے اجرت، اجر یا تنظیم کیلئے منافع، یہ وہ عناصر اربعہ ہیں ،جنہیں رائج معاشی نظریات میں آسمانی اصولوں کا مقام حاصل ہے، سرمایہ پر سود کے اصول کی بنا پر جس وقت سے سود نے باقاعدہ ذریعہ آمدنی کی حیثیت اختیار کر لی، بازار میں کئی ایک ناہمواریاں وجود میں آ گئیں، معاشی تگ ودو کا سارا حاصل، سمٹ کر چند ساہوکاروں کا نصیبہ ہوکر رہ گیا اور معاشی جدوجہد کے میدان میں سرمایہ کا حامل انسان، ایک مکمل محفوظ معاشی اکائی کی حیثیت سے متعارف ہوا جسے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں۔

جرمن کے ایک عالم معاشیات ڈاکٹر شاخت ہیں جو جرمن کے رائش بینک (Reich bank) کے گورنر بھی رہ چکے ہیں، دمشق میں ۱۹۵۳ء میں اپنے ایک لکچر میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ الجبرا کے ایک (لامتناہی) حساب کے ذریعہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا کی ساری دولت معدودے چند سود خواروں کے ہاتھوں میں کھنچ آنے والی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ سود پر قرض دینے والا ہمیشہ فائدہ حاصل کرتا ہے جب کہ قرض لینے والے کو کبھی نقصان ہوتا ہے اور کبھی فائدہ، ظاہر ہے کہ ساری دولت بالآخر اس کے ہاتھوں میں آجائے گی جس کا ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔(العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام: ۲۷۷)

سرمایہ وقرض پر سود کے جواز میں معاشیین نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں جو بنیادی طور پر قرض کی روح اور اس کی حقیقت سے صرفِ نظر پر مبنی ہے، بعضوں کے مطابق سود "سرمایہ سے استفادہ کا موقع فراہم کرنے کا معاوضہ ہے" بعضوں نے خیال ظاہر کیا کہ سود "اس مہلت کا معاوضہ ہے، جو سرمایہ دار نے قرض لینے والے کو اپنے سرمایہ کا استعمال کے لئے دی ہے" بعضوں نے کہا کہ "سود روپیہ کی اس قدر کا بدلہ ہے جو ماضی کے مقابلہ، مستقبل میں گھٹ گئی ہے"۔

یہ ساری توجیہات حقیقت میں خود غرضی واستحصال کی منطقی تعبیرات ہیں، خود غرضی اور استحصال ظاہر ہے، ایسے مفاہیم کے حامل الفاظ ہیں، جنہیں انسانی فطرت صبر وتحمل کے ساتھ سننا بھی گوارا نہیں کرتی اور انسانوں کے عرف میں کسی فعل وحرکت کا خود غرضی واستحصال کی

طرف انتساب بجائے خود اس کے ترک کی دلیل بن جاتا ہے، اس مخصوص مزاج کی بنا پر باپ اپنی اولاد کی پرورش کا معاوضہ کا کسی سے خواہاں نہیں ہوتا، ماں اپنی خدمات کے صلہ کے مطالبہ میں حق بجانب نہیں سمجھی جاتی، کسی ڈوبتے کو بچانے پر پیسوں کا مطالبہ خساست وگھٹیا پن کا انتہائی درجہ قرار دیا جاتا ہے، کسی ناتواں کو سہارا فراہم کرنے یا کسی کم توانا کو توانائی کی بہم رسائی پر معاوضہ کی خواہش کو غیر اخلاقی خیال کیا جاتا ہے۔

الغرض خودغرضی واستحصال کی مکروہ تعبیرات سے چوں کہ انسانوں کے معاشرے میں سود کا چلن بظاہر دشوار تھا، اس لئے ان مذکورہ بالا خوشنما تشریحات کی جعل سازی کی گئی اور انسانوں کی ذہنیت کو خراب کیا گیا، آخر کیا وجہ ہے، ایک انسان جب اپنی ضرورت سے (بشکل ِامانت) کسی دوسرے کے پاس اپنا سرمایہ رکھواتا ہے تو وہ اسے سالانہ یا ماہانہ سود کی بھرپائی نہیں کرتا لیکن وہی انسان جو دوسروں کی ضرورت سے (بطورِ قرض) سرمایہ اس کے حوالے کرتا ہے تو حوالے کے فوراً بعد والے لمحے سے، اسے اس دوسرے انسان سے ایک معیّن شرح پر سود کا استحقاق حاصل ہو جاتا ہے اور پھر اس کے جواز کے لئے وہ تمام تاویلات تصنیف کئے جاتے ہیں جن کو پہلی صورت میں حاشیۂ خیال میں لانا بھی مناسب نہیں سمجھا گیا تھا، جب کہ اس دوسری صورت میں سرمایہ بذاتِ خود قابلِ ضمانت ہوتا ہے، مزید تحفظ کیلئے فریقِ آخر کے اثاثہ جات پر قانونی بار (بشکلِ رہن) قائم کیا جاسکتا ہے یا پھر کفیل لیا جاسکتا ہے۔ سود کے جواز کی توجیہات کے پس پردہ جو اصل محرک تھا سطورِ بالا میں اس کی مختصر اُوضاحت کی گئی، بقیہ ان توجیہات کی غیر معقولیت سے متعلق دفعہ وار بحث اس سلسلہ کی کتابوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ (سود:۵۲۔۷۲)

سود کے قانونی جواز کی بنا پر دنیا کی معیشت پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان کی طرف ہلکے اشارے کئے جاتے ہیں:

(الف) ترجیحات کا تعیّن (Determination of priorities) وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources) کیا پیدا کیا جائے (what to produce) اور کیسے پیدا کیا جائے (How to produce) جو، ہر معیشت کے بنیادی

مسائل سمجھے جاتے ہیں، سود کے عمل دخل کی بنا پر غلط رخ پر چل پڑتے ہیں، اشیاء کی پیداوار کے معاملہ میں ترجیحات اور وسائل کی تخصیص کاری کا رخ بجائے قومی مفاد کے ذاتی مفاد کی جانب ہوجاتا ہے، ''شرح سود یہ طئے کردیتی ہے کہ سرمایہ اس کام میں صرف ہوگا جو مثلاً ٦ فی صدی سالانہ یا اس سے زیادہ منافع سرمایہ دار کو دے سکتا ہے، اس سے کم نفع دینے والا کوئی کام اس قابل نہیں کہ اس پر مال صرف کیا جائے، اب فرض کیجئے کہ ایک اسکیم سرمایہ دار کے سامنے یہ آتی ہے کہ ایسے مکانات تعمیر کئے جائیں جو آرام دہ بھی ہوں اور جنھیں غریب لوگ کم کرایہ پر لے سکیں اور دوسری اسکیم یہ آتی ہے کہ ایک شاندار سینما (تھیٹر) تعمیر کیا جائے، پہلی اسکیم ٦ فی صدی سے کم منافع کی امید دلاتی ہے اور دوسری اسکیم اس سے زیادہ نفع دیتی نظر آتی ہے ،دوسرے حالات میں تو اس کا امکان تھا کہ سرمایہ ''نادانی'' کے ساتھ پہلی اسکیم کی طرف جاتا یا کم ازکم ان دونوں کے درمیان متردد ہوکر استخارہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا مگر یہ شرح سود کا فیضِ ہدایت ہے کہ وہ سرمایہ کو بلاتامل دوسری اسکیم کا راستہ دکھادیتا ہے اور پہلی اسکیم کو اس طرح پیچھے پھینکتا ہے کہ سرمایہ دار اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا''۔(سود:۸۸۔۸۹)

(ب) طلب ورسد کے قدرتی پیمانوں کی مسخ شدگی: بازار کی معیشت میں سود کے غیر معمولی شیوع و پھیلاؤ کی وجہ سے، یہ پیمانے اب معاشرے کی حقیقی ضرورتوں کے ساتھ وابستہ نہیں رہے بلکہ شرحِ سود پر موقوف ہوکر رہ گئے، بازار میں کسی چیز کی بہتات کا مطلب اب یہ نہیں رہا کہ اس کی ضرورت واقعتہً لوگوں کو زیادہ ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدا کنندگان کی دانست میں رسد کردہ شئے کی پیداوار ہی شرحِ سود کی بسہولت ادئیگی میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

(ج) اشیاءصرف کے نرخوں میں غیر معمولی اضافہ: اشیاء کی پیداواری لاگت میں جب ایک قابل لحاظ حصہ سود کا شامل رہے گا تو پیداکنندہ مجموعی مصارف میں سود کو بھی محسوب کریگا، اس طرح فی اکائی قیمت جو بلاسودی سرمایا کاری کی صورت میں کم ہوتی تھی سودی سرمایہ کاری کی بنا پر زیادہ ہوگئی، جس کا بوجھ بالآخر عام صارفین کے جیب پر پڑے گا (اسلام اور جدید معیشت وتجارت:۵۳)

(د) معاشی نقطۂ نظر سے سودی نظام کی ایک بڑی بھیانک خرابی یہ ہے کہ پیسہ سے پیسہ بنانے کی دُھن میں عاملِ محنت بڑی حد تک مفلوج ہوکررہ گیا، ہر اونچے سرمایہ والا، نسبتاً اپنے سے کم حیثیت والے کو سرمایہ فراہم کرکے بے محنت سود بٹورنے کو عافیت بخش سودا سمجھ رہا ہے، جس کے نتیجہ میں بنیادی ذرائع معاش کھیتی وغیرہ معطل ہوکر رہ گئے، اجناس وتغذیہ کی قلت پیدا ہوگئی اور گرانیاں آسمان کو چھونے لگیں، حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلیؒ نے کس قدر نکتہ کی بات بیان فرمائی ہے: جب اس طرح زر سے زر پیدا کرنے کی ریت چل پڑتی ہے تو لوگ بنیادی ذرائع معاش: کھیتیاں وکاریگریاں چھوڑ دیتے ہیں؛ مثل مشہور ہے: جب روٹی ملے یوں تو کھیتی کرے کیوں! (رحمۃ اللہ الواسعۃ: ۵۴۲)

معیشت پر مجموعی اعتبار سے سودی نظام کے بدترین اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بجا لکھا: ملک کا ایک قلیل گروہ یعنی ایسے لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ ہورہی ہو اور ان کے پاس قدرِ حاجت سے بچ کر، پس انداز ہ بھی ہوتا ہو، جو عموماً ہر ملک وقوم میں تھوڑے ہوتے ہیں، جب یہ اپنے روپیہ کو سود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو ان کے یہی روپیے، ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتے ہیں اور صدی ڈیڑھ صدی کے بعد یہ تماشہ نظر آتا ہے کہ قوم کے اکثر افراد بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور معدودے چند گھرانوں یا شخصیتوں کے پاس دولت کا ورم پیدا ہوگیا ہے، پھر بات اس حد پر آکر رک نہیں جاتی، ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے، تنگ آکر ان سودخوروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا وحشیانہ حملہ ہوجاتا ہے پھر اس کے بعد ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے، سلطنتیں تباہ ہوجاتی ہیں، امن وامان غارت ہوجاتا ہے، غرباء بھوکے غضبناک بھیڑیوں کی طرح دولتمندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں تاریخ ان نتائج کو آج یورپ میں دہرا رہی ہے یا دُہرانے والی ہے (اسلامی معاشیات: ۳۳۳)

(۳) قوتِ صرف کا غلط استعمال

بیروزگاری، مفلوک الحالی، کساد بازاری کے بڑھاوا دینے میں مذکورہ عامل بھی فیصلہ کن

رول ادا کرتا ہے،عنوان بالا کے تحت متعلقہ تمام شکلوں کا احاطہ مقصود نہیں،البتہ اس کے صرف دو مظاہر یا دو افراد کی جانب نشاندہی کی جاتی ہے،جن میں سے ایک کا تعلق انفرادی بے راہ روی سے ہے اور دوسرے کا تعلق قومی قوتِ بے راہ روی سے ہے یعنی

(الف) تعیشات پرصرف (ب) لایعنی مہنگی مہمات پرصرف۔

(الف) تعیّشات پرصرف (consumption on luxurises)تعیّشات کا تعلق،انسانی زندگی کے اس شعبہ سے ہے جس کو مقصدِ حیات بنانا یا جس کی تکمیل کے درپئے ہونا،موقع ومحل کے تقاضوں سے تغافل کے مترادف ہے،دائمی زندگی کے بجائے چندروزہ حیات مستعار ہی میں،ان کے حصول کو سب کچھ سمجھنا اس سے زیادہ نہیں کہ بجائے مکان کے رہائشی حصہ کی طرف توجہ کرنے کے،کوئی شخص اپنی ساری توجہات ودلچسپیاں پائینِ خانہ (بیت الخلاء) پرمرکوز کردے۔

چونکہ تعیّشات پر انسانی زندگی کا بقا موقوف نہیں پھر بالعموم عیش کوشی ، خدافراموشی کا مقدمہ بن جاتی ہے،اس لئے علیم وخبیر ذات نے انسانوں کے بڑے طبقہ کو اس سے محروم ہی رکھا ہے،جو فی الاصل ان کے حق میں خیرخواہی ہے،سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو عیاں کیا ہے:''اور اگر اللہ تعالی اپنے بندوں کے لئے روزی کو فراخ کردیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے لیکن جتنا رزق چاہتا ہے،اندازہ سے اتارتا ہے وہ اپنے بندوں کو جاننے والا اور دیکھنے والا ہے''۔(سورہ شوریٰ:آیت:۲۷)

جب انسانوں کی اقل قلیل تعداد اپنی بسطی وفراخی حالت سے غلط فائدہ اٹھائے گی اور فاضل سرمایہ کا بہاؤ بجائے قدری وتنگی حالت والے انسانی طبقہ کی جانب کرنے کے اپنی عیش کوشی پر کرنے لگے گی تو بازار میں ضروریات (Neccessities) کی بہ نسبت سامانِ تعیّشات کی بھرمار ہوگی ،جس کے نتیجہ میں ضروریات کے نرخ چڑھنے لگیں گے پھر رفتہ رفتہ تعیّشات کی طرح ،جو پہلے ہی سے قوتِ خرید سے خارج ہیں،ضروریات کی خریداری بھی ایک بڑے طبقہ کے دسترس سے باہر ہوجائے گی اور معیشت کساد بازاری کا اور قوم غربت وافلاس کا شکار ہوجائے گی۔

واقفِ اسرارِ شریعت حضرت شاہ صاحبؒ نے کیا خوب لکھا ہے: اس طرح یہ امر بھی تمدن کی خرابی کا باعث ہے کہ امراء، زیورات، پوشاک، تعمیرات، خورد ونوش، عورتوں کے گداز پن اوران کے مانند چیزوں میں دلچسپی لینے لگیں، جب یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے گی تو لوگ مادی چیزوں میں تصرف کرنے کو ذرائعِ معاش بنا لیں گے تاکہ عیش پرستوں کی خواہشات پوری ہوں، پس کچھ لوگ لونڈیوں کو گانے ناچنے اورلذیذ ودل پسند تھرکنے کی تعلیم دیں گےاوردوسرے سونے کی حیرت انگیز ڈھلائی اورعمدہ ہیرا تراشی کرینگےاور کچھ لوگ، بلند عمارتوں اوران کی نقاشی اورمصوری کریں گےاور جب لوگوں کا جم غفیران چیزوں کو ذرائع معاش بنالے گا تو کاشتکاری اورتجارتیں رائیگاں ہو جائیں گی اور جب امراءان چیزوں میں دولت خرچ کریں گےتو شہر کی دیگر مصلحتیں رائیگاں ہو جائیں گی اور یہ چیزیں ضروری ذرائع معاش کا اہتمام کرنے والوں پر مثلاً کاشتکاروں، بیوپاروں اور کاریگروں پر تنگی اوران پر ٹیکسوں کی بھرمارتک پہنچادے گی تاکہ ان ٹیکسوں سے امراءعیش کریں اوراس طرح مملکت تباہ ہوجائے گی۔(رحمۃ اللہ الواسعۃ: ۵۳۸)

(ب)لایعنی جنگی مہمات پرصرف: قومی آمدنی کا ایک بڑا حصہ، وقت کی حکومتیں ہوسِ جہانبانی میں صرف کررہی ہیں اسلحۂ جنگ اورایٹمی ہتھیاروں کی بلاوقفہ تیاریوں کی وجہ سے نہ صرف قومی توانائی ومحنت کا بڑا حصہ ضائع ہورہا ہے بلکہ بیشتر قومی سرمایہ دھویں اورآگ کی نذر ہورہا ہے، ماہرین کے مطابق اس سرمایہ کا تناسب اس قدر زیادہ ہے کہ اگر معاشی خوشحالی اور قوموں کی ترقی کے لئے اس کی بازیابی ہوجائے تو پھر بلا مبالغہ کئی ایک معیشتوں کوسنبھالا مل سکتا ہے کئی مملکتوں کے سربراہان پر جنگ جوئی وملک گیری کا خبط ایسا سوار ہو گیا ہے کہ اس حوالہ سے انہوں نے نہ صرف یہ کہ قومی آمدنی کے کثیر حصہ کوتباہی میں جھونک دیا ہے بلکہ اس کارخیر کیلئے بے تحاشہ قرض حاصل کرکے اپنے ملک کوقرض کے عمیق دلدل میں پھانس دیا ہے ،سود پر جب چاہے قرض کے حصول کی سہولت نے معاملہ کومزید ہولناک کردیا ہے۔

مولانا گیلانی لکھتے ہیں: ماہرین کا بیان ہے کہ سود پر بآسانی حکومتوں کوروپے قرض اگر نہ ملتا تو یومیہ کڑوڑہا کڑوڑروپے کی رقم موجودہ جنگوں میں جوصرف ہورہی ہیں، اتنی رقم کی

فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا، گویا آج سود ہی اعلانِ جنگ اور اس ہولناک جنگ حرب من اللہ ورسولہ کا ذریعہ بنا ہوا ہے جس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں مفقود ہے اور پھر اس ہولناک جنگ کے ذریعہ سے انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن بن کر کچھ ہوائی فضاؤں میں اور کچھ جہاز، تارپیڈو اور خدا جانے کیا کیا بن کر سمندر کے پانیوں میں محق وفرسودہ ہو ہو کر برباد ہو رہی ہیں (اسلامی معاشیات:۳۳۴)

(۴) مبادلہ کے نظام کی بربادی

کاروباری عرف میں ہر لینے والا دینے والا بھی ہوتا ہے، اسی پر کاروبار کا صحت اور متوازن بقا موقوف ہے،اب اگر انسانوں کا ایک گروہ یکطرفہ صرف لیتے رہنے کو کسب اور پیشہ بنالے تو اس سے معاشی ڈھانچے میں، ایک غیر متوزن کیفیت رونما ہوگی اور ایک طبقہ کی اکتسابی قوتیں اپنے صحت مند نتائج ظاہر کئے بغیر ہی، گذرتے وقتوں کے ساتھ دفن ہوتی چلی جائیں گی، یہ عامل بھی نظامِ معیشت میں بگاڑ اور ناہمواریاں پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، اگلے وقتوں ہی سے انسانی معاشرے میں ایسے مفت خوروں کا معتد بہ مقدار میں وجود رہا ہے جو دانستہ، قدرت کی بخشی ہوئی اکتساب صلاحیت کو بے دریغ برباد کرنے کو کوئی جرم خیال نہیں کرتے، اس طبقہ کا ایک حصہ تو مذہبی مفت خوروں پر مشتمل رہا جو کوئی عوض ادا کئے بغیر نوع بہ نوع باطل ہتھکنڈوں کے ذریعہ اپنی تجوریاں آباد کرنے میں مصروف رہا اور دوسرا حصہ ان دنیاداروں کا رہا جو فریقِ آخر کی آمادگی یا غیر آمادگی کیساتھ، یکطرفہ دولت سمیٹتا رہا،اس سلسلہ میں جواری پیشہ، سٹہ باز افراد اور جرائم پیشہ، چوری ڈکیت کے عادی افراد کا نام لیا جاسکتا ہے، دنیا کی معیشت پر اس طبقہ کے جو برے اثرات مرتب ہوتے ہیں؛ اس کی وضاحت کے لئے اہل نظر علماء کے یہ نصوص ملاحظہ ہوں:

''یورپ میں تو اعترافِ جرم'' کا ایسا ہتھکنڈہ مذہبی پیشہ وروں کو مل گیا تھا کہ ہر آدمی اپنے جرائم کا پادری کے سامنے کا اقرار کر کے بظاہر خدا کی گرفت سے تو سمجھتا تھا کہ اسے نجات مل گئی لیکن درحقیقت، وہ پادریوں کی گرفت میں آجاتا تھا،.....گرجوں اور چرچوں کے خزانے شاہی خزانوں سے کہیں زیادہ وسیع ہوچکے تھے،معمولی معمولی گرجوں میں لاکھوں کی

دولت بصورتِ کنز جمع رہتی تھی ، مشہور واقعہ ہے کہ ہرقل کو ایرانیوں کے مقابلہ میں فوجی مصارف کی جب ضرورت ہوئی اور شاہی خزانہ ان مصارف کی پابجائی میں ناکافی ثابت ہوا تو روم کے اس قیصر کو قرض کی صورت میں سب سے بڑی مالی امداد چرچوں اور گرجوں میں سے ملی ،تقریباً یہی حال ہندوستان میں برہمنوں ،سادھوؤں ،جوگیوں نے پیدا کر رکھا تھا،خود محمود غزنوی کو سومنات میں جو غیر معمولی سرمایہ ہاتھ آیا تھا، وہ ہندو مذہب کے احبار ورہبان کی کنز کی ہوئی دولت ہی تھی ،اس زمانے میں زار کی حکومت پر انقلاب برپا کر کے جب اشترا کیوں نے اقتدار حاصل کیا تو کون نہیں جانتا کہ شاہی خزانوں اور امراء کے اندوختہ دولت کے ساتھ بولشویک حکومت کو سرمایہ کی غیر معمولی مقدار روسی گرجوں ہی سے ملی ......اس سے انکی اکتسابی قوتیں اپنے وفاداری اور معاشی نتائج کو ظاہر کئے بغیر مسلسل نسلاً بعد نسل قبروں میں دفن ہوتی چلی جارہی ہیں۔(اسلامی معاشیات:۱۲)

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتھم تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں : جوا،ایک باطل اور حرام معاملہ ہے اس کے ذریعہ لوگوں کے اموال جھپٹ لئے جاتے ہیں .....اور قمار بازی کی جب عادت پڑ جاتی ہے تو آدمی اپنی ساری دولت لٹا دیتا ہے، لمبے چوڑے جھگڑوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور تمدن کو ترقی دینے والے ضروری کام رائیگال ہو جاتے ہیں اور جواری،لوگوں کی معاونت سے اعراض کرتے ہیں جس پر تمدن کی بہبودی کا مدار ہے،عیاں راچہ بیان! مشاہدہ ان سب باتوں کی تصدیق کریگا۔کیا آپ نے کوئی قمار باز ایسا دیکھا ہے جس میں یہ باتیں نہ پائی جاتی ہوں!(رحمۃ اللہ الواسعۃ:۵۴۱/۴)

الحاصل زیرِ نظر مضمون میں مختصراًان چار عوامل کی تشخیص کی گئی ہے جو معیشتوں کی بربادی کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں،معیشت کے قالب میں جب تک یہ جرثومے موجود رہیں گے ،موت سے اس کی قربت بڑھتی جائے گی ،ان کے وجود کو گوارا کرتے ہوئے اصلاحات کے دعوے یا تجاویز ، بس ایک موہوم سی حقیقت ہوگی ، اسلامی نظامِ معیشت میں چونکہ ان بدعنوانیوں ، بے اعتدالیوں کیلئے کوئی راہ نہیں اس لئے اس میں اس بے استحکامی بھی نہیں ، اسلامی نظامِ معیشت ، جو قرآن وسنت کے نصوص اور ان کے شارحین کے دیانتدارانہ قول وعمل

سے ماخوذ ہے، ایک ایسا نہایت ہی معقول، متوازن مبنی بر انصاف نظام ہے جس کی نظیر نہیں۔

فرد کی آزادئ کسب کے اختیار کو اسلام نے تسلیم کیا ہے البتہ اسے چند ایسے ناگزیر قوانین کے تابع کیا جو معاشرتی مفاد کے تحفظ کے ضامن ہیں، بازار میں طلب و رسد کے فطری قوانین کی اثر اندازی و بالا دستی کو تسلیم کیا ہے، معیشت میں حکومت کی مداخلت کو رعایا کی مصلحت و بہبودی کے ساتھ مربوط کیا ہے، معیشت کو کمزور کرنے والے عوامل واسباب پر قانون واخلاق ہر دو کے ذریعہ روک لگائی ہے، معاشی فوائد سے محروم رہ جانے والے ضعیف طبقہ کیلئے انتہائی منظّم اجتماعی کفالت کا نظم رکھا گیا ہے، زکوٰۃ وصدقات اور دیگر حکومتی آمدنیوں کے ذرائع سے ان کے تعاون کو ممکن بنایا گیا، درآمد و برآمد کے بین ممالکی تجارتی تعلقات کو سہل بنایا گیا، برائے نام محاصل ان پر عائد کئے گئے، اندرونِ مملکت و بیرونِ مملکت تجارتی روابط اور معاشی تال میل میں باقاعدگی پیدا کی گئی، وغیرہ۔

انہی اصول وہدایات کو مدِ نظر رکھ کر، مسلمانوں نے عملی طور پر اپنے درخشاں دور میں دنیا کو ایک ایسی معاشی مملکت کا تصور دیا تھا جو اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے باوجود، اس قدر مستحکم تھی کہ جہاں ڈھونڈے کوئی دریوزہ گر یا معاشی شکوہ سنج نہیں ملتا تھا، عمرؓ اول اور عمر ثانیؒ کے ادوار بالخصوص اس حوالے سے بڑے ہی بے نظیر ہیں۔

حضرت معاذ بن جبلؓ زمانۂ رسالت ہی سے یمن کی گورنری پر مامور تھے، حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں یمن کی خوش حالی کا عالم یہ تھا کہ پہلے سال یمن کے باشندوں سے وصول کردہ صدقات کا دوتہائی حصہ، وہاں کے فقراء پر صرف ہوسکا، ایک تہائی دار الخلافہ مدینہ بھیج دیا گیا، دوسرے سال وہاں کی عوام کی آسودگی کا تناسب مزید بڑھا اور صرف ایک تہائی صدقات صرف کئے جاسکے، بقیہ دوتہائی مدینہ بھیج دیئے گئے، تیسرے سال کل وصولی، اس عریضہ کیساتھ روانہ کردی گئی کہ یہاں یمن میں کوئی فرد ایسا ملتا ہی نہیں کہ جو زکوۃ وغیرہ کو لے لے۔ (کتاب الاموال لابی عبید)

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانۂ خلافت کا حال، ان کی حکومت کے نظم ونسق سے وابستہ ایک عامل کی زبانی سنئے: یحی بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبد العزیزؒ نے افریقہ میں

زکوٰۃ کی تحصیل اور وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوۃ وصول کی جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے، جن کو وہ رقم دی جائے تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا جس کو زکوٰۃ دی جاسکے، عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب کو غنی بنادیا، آخر، میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کئے اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنادیا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ۱/۵۲)

اقوام عالم کو اب بھی موقع ہے کہ بلا کسی تحفظاتِ ذہنی کے، کم ازکم معاشی میدانوں میں اسلام کے اِن عادلانہ اصولوں کا تجربہ کر کے دیکھ لیں اور اِن کی افادیت کے قائل ہونے میں عناد وتعصب کو راہ نہ دیں، معاشی نظام کی اصلاحات اور عالمی بحران کے خاتمہ کے لئے بچکانی حرکتوں کے بجائے سنجیدہ اقدامات کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے!

پاکیزہ صحافت اسلامی نقطۂ نظر

صحافت، ذرائع ابلاغ کا ایک ذمہ دارانہ شعبہ ہے، صحافت کے واسطے سے عالمی خبر نامے، ملکی حالات، ماحولیاتی تغیرات پوری قوم کے سامنے آتے ہیں، کامیاب صحافت کیلئے ایک طرف نہ صرف بے وثوق واقعات واطلاعات سے صرفِ نظر کرنا پڑتا ہے بلکہ دوسری طرف واقعات نگاری میں واقعیت کے پہلو کو مدنظر رکھنا، خبروں کی اشاعت میں تعمیری اسلوب کو زیرِ دست رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے ورنہ بسا اوقات اخبار واقعات کی غیر متوازن رپورٹنگ کے نقصانات، ان کی لاعلمی سے برآمد ہونے والے نتائج سے زیادہ بھیانک ثابت ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے موجودہ صحافت میں بعض عناصر، صحافت کے ان مسلمہ اصولوں کی دانستہ خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں، بعض گوشوں سے محض تنکوں کا پُل تعمیر کیا جاتا ہے، بے تحقیق غیر مستند خبروں یا واقعات کو شائع کر کے یا تو شخصیات کو مجروح کیا جاتا ہے یا قوموں کے لئے غلط راہِ فکر وعمل ہموار کی جاتی ہے، گویا مہذب طور پر دروغ وکذب کے فروغ کا سامان کیا جاتا ہے، کبھی رائی کا پربت بنایا جاتا ہے، حقیقت پر دجل وفریب کی اس قدر غلاف آرائی کی جاتی ہے کہ معاملہ کی تہہ تک پہنچنا سخت مشکل اور جگرتوڑ مرحلہ ثابت ہوتا ہے، کبھی مبنی برحقیقت خبروں کی اشاعت، اس بھونڈے انداز سے کی جاتی ہے کہ قاری بے اختیار نامہ نگار پر لعنت بھیجنے لگتا ہے۔

حالیہ دنوں میں صحافتی اقدار سے انحراف کے سلسلہ وار مظاہر، منظرِ عام پر آئے ہیں، ایک معروف اردو روزنامے میں، ایک محترم شخصیت کے اظہارِ خیال کو غلط سیاق میں لیکر ناحق ان پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی گئی، ایک اور مشہورِ عام انگریزی روزنامے ''دکن کرانیکل'' میں نامور موسیقار اے آر رحمٰن کو عالمی سطح کے ایوارڈ سے نوازے جانے کی رپورٹنگ اس غلط انداز

سے کی گئی کہ رپورٹر اور خبر کے سرخی ساز کی بدد ماغی پر خون کھولنے لگتا ہے، روز نامہ مذکور میں دانستہ طور پر ایسی سرخی لگائی گئی تھی، جس سے بجا طور پر عنوان ساز بلکہ پورے عملہ کی شر پسندی کا ثبوت ملتا ہے ۔سرخی کے انگریزی الفاظ یوں تھے: Rahman is the top (dog)

اِدھر بعض عوامل کی بنا پر صحافت، ایک نرالی ہی راہ اختیار کئے ہوئے ہے یعنی صحافت میں نجی سیاست کی آمیزش، اس راہ سے نہ جانے کتنے حقائق کو مروڑا جارہا ہے، کتنے ہی واقعات و واردات کا سرِ رشتہ ذاتی مفادات سے جوڑا جارہا ہے، کتنی ہی ضروری خبروں کو نظر انداز کر دیا جارہا ہے، غرض خیانت و بددیانتی کی ایک لہر ہے جو چلتی چلی جارہی ہے۔

ہر چند کہ قرنِ اول یا زمانۂ رسالت میں صحافت کی موجودہ ترقی یافتہ شکل کا وجود نہیں تھا، عام طور پر اخبار رسانی اور معلومات آگہی میں زیادہ تر اعتماد انسانی وسائط ہی پر ہوتا تھا، تاہم دورِ نبوی ﷺ میں ابلاغ کی جو شکل بھی رائج رہی ہو، اس سے اور دیگر اسلام کی عمومی تعلیمات سے بآسانی، اسلامی پاکیزہ صحافت کا مکمل خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے، مثلاً صحافت کے صالح اقدار کیا ہوں، تعمیری صحافت کی خصوصیات کیا ہوتی ہے، صحافت کو آلودہ اور داغدار کرنے والے عناصر کیا ہوتے ہیں، کیسی خبروں کی اشاعت ضروری ہوتی ہے اور کن خبروں کو قلمزد کر دینا ہی عین قرینِ مصلحت ہوتا ہے، وغیرہ، ذیل میں اس تعلق سے قدرے وضاحت کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا جاتا ہے۔

صحافت خیر کا سرچشمہ ہو

خیر کی اشاعت کو صحافتِ اسلامی کے بنیادی مقاصد میں سے قرار دیا جاسکتا ہے، معاشرے میں بھلائی کا فروغ، عامۃ الناس کی اصلاحِ حال، تعاون باہمی کیلئے لوگوں کی ذہن سازی، جیسے اعلیٰ مقاصد صحافت کے پیشِ نظر ہوں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ خیر خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں (البتہ ان کے مشوروں میں خیر اور برکت ہے)۔(سورۃ النساء آیت:۱۱۴) سورۂ حشر آیت:۹ میں ہے: اے ایمان والو! تم سر

گوشی کروتو گناہ اور زیادتی اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی سرگوشیاں مت کرو اور نفع رسانی اور پرہیزگاری کی باتوں کی سرگوشیاں کرو (تاکہ زیادتی ونقصان کے بجائے نفع رسانی کی اور گناہ کے بجائے پرہیزگاری کی فضا قائم ہو)۔

خیر کی اشاعت، مذہبِ اسلام میں اس قدر مطلوب ہے کہ اگر اس کی خاطر گفتگو و بیان میں کسی قدر ہیر پھیر سے کام لیا جاتا ہے تو اس کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے وہ شخص جھوٹا نہیں کہلاتا جو لوگوں کے مابین اصلاح کرتا ہے، ان کو آپس میں جوڑتا ہے پھر ان کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لئے بھلی بات کہتا ہے یا بھلی بات نقل کرتا ہے۔(بخاری: باب لیس الکذاب:۲۶۹۲)

صحافت سچائی کا علمبردار ہو

پاکیزہ صحافت کے لئے مسلمہ حقائق اور مستند خبروں ہی کی اشاعت کا التزام رکھنا ازبس ضروری ہے، جھوٹی خبروں کا شائع کرنا، بے بنیاد باتوں کو پھیلانا، صحافت کی اعتباریت ہی کو ختم کردیتا ہے، ارشاد باری ہے: اور جس بات کی تحقیق نہ ہو، اس پر عمل درآمد مت کیا کرو (یعنی نہ اس کو نقل کرو اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی اقدام کرو)۔ (سورۃ بنی اسرائیل آیت:۳۶)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے مبارک دور میں، ابلاغ کے متعارف ذرائع کو اشاعتِ حق ہی کا خادم بنایا تھا، کوہِ صفا سے پہلی دفعہ پوری انسانیت نے اور خاص طور پر باشندگانِ حرم نے ایسا سچ سنا، جس سے زیادہ سچا، دنیا میں کوئی اور پیغام نہیں، اسی طرح حجاج کے قافلوں میں اور عرب کے مشہور زمانہ میلوں میں حق اور سچائی ہی کی تشہیر کی جاتی تھی، اس کے بالمقابل حامیانِ کذب، ذرائع ابلاغ کو جھوٹ کی ترویج کے لئے استعمال کرتے تھے، مشرکین مکہ، جھوٹ کی تشہیر کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، زمانۂ جاہلیت میں حج کا موقع اور دیگر اجتماعی تقاریب کے مواقع، ان کی ناپاک مہم کے فروغ کیلئے گویا موسمِ بہار ثابت ہوتے ،عرب کے میلوں، **عکاظ، مجنه اور ذو المجاز** میں قریش کے وفود پھیل جاتے اور دین حق کے خلاف ہر طرح کے وساوس لوگوں کے دلوں میں ڈالتے ،سورۃ العصر کی تفسیر کے تحت ایک صاحبِ علم رقم طراز ہیں: معاشرہ میں یہ روح جاری وساری رہے کہ جب اور جہاں بھی

باطل سر اٹھائے، کلمۂ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں اور معاشرہ کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راست بازی اور عدل وانصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو اس طرزِ عمل کی نصیحت کرے، یہ وہ چیز ہے جو معاشرہ کو اخلاقی زوال وانحطاط سے بچانے کی ضامن ہے، اگر یہ روح کسی معاشرہ میں موجود نہ رہے تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا۔ (تفہیم القرآن ۶/۴۵۳)

ذرائع کے باوثوق یا بے وثوق ہونے کی تحقیق ہو

ذرائع کے مستند اور غیر مستند ہونے کا لحاظ کئے بغیر خبروں کی اشاعت کرتے چلے جانا، در حقیقت کذب بیانی ہی کا ایک حصہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرنا شروع کردے، یعنی ذرائع کے سچا یا جھوٹا ہونے کی تحقیق کئے بغیر ہی بیان بازی شروع کردے، قرآن کریم نے ان ناسمجھ لوگوں کے طرزِ عمل پر سخت نکیر کی ہے جو حقیقتِ حال معلوم کئے بغیر، ہر اچھی بری خبر کو معاشرے میں پھیلانے کیلئے بے تاب رہتے ہیں۔ (فتح الملہم ۱/۱۲۵) ایک اور ارشادِ نبوی ﷺ ہے: یہ بڑا سنگین قسم کا جھوٹ ہے کہ آدمی کسی نہ دیکھی ہوئی بات کو عینی مشاہدہ کے طور پر بیان کرے (بخاری: ۳۵۰۹) ہُد ہُد نے جب اپنی غیر حاضری کے عذر میں، ملکۂ سبا کی سلطنت، اس کی اور اسکے قوم کی آفتاب پرستی کی خبر، حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں گوشِ گذار کی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کسی عملی اقدام سے قبل، خبر رساں یعنی ہُد ہُد کے سچے یا جھوٹے ہونے کی تحقیق کو ضروری خیال فرمایا، چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے (سورۃ النمل آیت: ۲۷) سورۂ حجرات میں مسلمانوں کو عام حکم ہے کہ اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرلیا کرو، کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچادو پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔ (سورۃ الحجرات آیت: ۶)

مدنی زندگی میں خاص طور پر غزوۂ احد سے چند سالوں تک کا زمانہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے یا غفلت میں ڈالنے کیلئے منصوبہ بند افواہیں اڑائی جاتی تھیں، بعض ہنگامہ

پسند قسم کے لوگ (منافقین وغیرہ) ان افواہوں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے، انھیں اس کی خبر یا پرواہ نہیں تھی کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ افواہیں پھیلانے کے نتائج کس قدر دوررس ہوتے ہیں، سورۂ نساء آیت: ۸۳ میں ایسے لوگوں کی سرزنش کی گئی اور انھیں سختی کے ساتھ متنبہ فرمایا گیا کہ افواہوں کو فروغ دینے، ایک دوسرے تک پہنچانے کے بجائے، چاہئے کہ ان افواہوں کو ایسے ذمہ دار افراد کی طرف رجوع کردیا جائے جو معاملہ فہمی اور تحقیقِ حال کی قدرت واہلیت رکھتے ہو، عالمِ برزخ کے متعلق خواب کے موقع سے آپ ﷺ نے ایک آدمی کو اس حال میں دیکھا کہ اس کے جبڑے گدی تک چیرے جارہے ہیں، آپ ﷺ کو بتلایا گیا کہ یہ وہ آدمی ہے جس کا پیشہ جھوٹ بولنا، جھوٹ پھیلانا تھا، اس کی کہی ہوئی جھوٹی بات پھیلتے پھیلتے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی تھی جن سے لوگ گمراہ اور غلط فہمی کا شکار ہوجاتے تھے (بخاری: باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح: ۷۰۴۷)

مصلحت بین وحکمت شعار ہو

بسا اوقات ذرائع باوثوق ہوتے ہیں، خبر میں واقعیت کا پہلو غالب رہتا ہے، حادثہ کے یقینی ہونے کے سارے قرائن موجود رہتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کا اظہار اور ان کی تشہیر مصلحت کے خلاف ہوتی ہے، ان مواقع پر افشا کی صورت میں روپذیر ہونے والے مفاسد کے پیشِ نظر، بجائے اظہار واعلان کے اخفا ہی قرین حکمت ہوتا ہے۔

موجودہ صحافت میں بڑے پیمانہ پر یہ نزاکت نظر انداز ہورہی ہے، جسکی بنا پر بے شمار خرابیاں رونما ہورہی ہیں، شیخ سعدیؒ نے بجا نقل کیا ہے کہ" خردمنداں گفتہ اند دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز": یعنی عقلمندوں کا کہنا ہے کہ کسی ضروری مصلحت پر مبنی جھوٹ، فساد برپا کردینے والی سچائی سے بسا غنیمت اور بہتر ہوتا ہے، ذیل میں اس حوالے سے سیرت کے ایک دو نمونے پیش خدمت ہیں: غزوۂ خندق کے موقع پر بنوقریظہ کی بدعہدی کی سنسنی خیز اور لرزہ براندام خبر مشہور ہوئی، بڑا نازک مرحلہ تھا کیوں کہ خبر کے صحیح ہونے کا مطلب، خندق کی ساری کھدوائی وتیاری کا اکارت اور بے معنی ہوجانے کے مماثل تھا، رسول اللہ ﷺ نے بلا کسی تاخیر رئیسانِ اوس وخزرج حضرت سعد بن معاذؓ وحضرت سعد بن عبادہؓ کو

تحقیقِ حال کے لئے روانہ فرمایا، جاتے وقت بطورِ خاص یہ تاکید فرمائی کہ اگر خدانخواستہ خبر سچی نکلے تو لوٹنے کے بعد برملا اس کا اعلان نہ کرنا بلکہ ایسے انداز سے اشاروں کنایوں میں مجھ سے بیان کرنا کہ تنہا میں اس کو سمجھ لوں، (کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی بدعہدی کی عمومی اطلاع سے لشکرِ اسلام میں بے دلی اور مایوسی کی کیفیت پیدا ہو جائے) اور اگر قبل ازیں لوگوں کے درمیان شائع شدہ خبر، جھوٹی نکلے تو علی الاعلان بیان کر دینا کہ بنو قریظہ اپنے عہد پر قائم ہیں، اندیشہ کی ضرورت نہیں، اتفاق سے بنو قریظہ کی بدعہدی کی خبر واقع کے مطابق نکلی، حضرات سعدینؓ جب واپس ہوئے تو کمالِ احتیاط کے ساتھ، خفیہ زبان ہی میں آپ ﷺ کو اس کی خبر دی، خبر سن کر رسول اللہ ﷺ نے بھی کسی تشویش کو ظاہر ہونے نہیں دیا بلکہ نعرۂ تکبیر بلند فرمایا اور مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: اے مسلمانوں فتح کی بشارت ہو(السیرۃ النبویۃ ابن کثیر ۳/۲۰۰) آپ ﷺ کی حکمت بھری اس تدبیر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خبروں کی اشاعت میں کس قدر دانشمندی و دور اندیشی کا مظاہرہ ضروری ہے۔

ایسے ہی غزوات کے لئے مدینہ سے نکلتے وقت' رخ طئے کرنے میں آپ ﷺ کا دائمی معمول شریف توریہ کا رہا ہے، مثال کے طور پر منزلِ مقصود جانبِ مشرق ہوتی تو مدینہ سے مغربی سمت تشریف لے چلتے پھر گھوم کر مشرق کی راہ پر آ لیتے، اس طریقہ کار سے منشا یہ ہوتا کے منافقین سے مسلمانوں کہ منصوبے و مقاصد پوشیدہ رہیں اور دشمن کے جاسوسوں کو اصل صورتحال کی اطلاع نہ ہو سکے۔ (تکملہ فتح الملہم ۶/۴۳)

کسی کی ذاتیات میں دخیل نہ ہو

صحافت کے واسطہ سے کسی انسان کے نجی امور منظر عام پر لانا پھر مختلف قسم کے تبصروں تنقیدوں کے ذریعہ اس کی ذاتیات سے کھلواڑ کرنا، حدِّ اخلاق سے نہایت گری ہوئی حرکت ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ناحق کسی مسلمان کی ناموس سے کھلواڑ کرنا بدترین زیادتی ہے(ابوداؤد: باب فی الغیبۃ :۴۸۷۶) ایک اور روایت میں ارشاد ہے: مسلمانوں کے درپئے آزار نہ بنو، ان کو عار مت دلاؤ، ان کے پوشیدہ عیوب کا پیچھا مت کرو' کیونکہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے پوشیدہ عیب کا پیچھا کرتا ہے تو اللہ اس کے عیوب کا تعاقب کرتے ہیں

اور اللہ جس کے عیوب کا تعاقب کرتے ہیں تو گھر کی محفوظ چہار دیواری میں ہونے پر بھی اسے بے آبرو کر دیتے ہیں (ابوداؤد: باب فی الغیبۃ: ۴۸۸۰)

اِدھر جب سے صحافت میں یہ لعنت در آئی ہے تب سے یہ ذریعۂ ابلاغ کئی ایک بے اعتدالیوں کا یرغمال ہو کر رہ گیا، جن میں سے نمایاں یہ ہیں: ایک دوسرے پر بے تحقیق الزام تراشیاں، پوشیدہ نقائص وعیوب کی پردہ دری، غیر ضروری ٹوہ بازی وغیرہ، حالانکہ یہ ساری چیزیں نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے سخت ممنوع اور سنگین گناہ ہے بلکہ صحافت کے مسلمہ اقدار کے بھی خلاف ہیں، ارشاد خداوندی ہے: اے ایمان والوں بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیوں کہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور (کسی کے عیب کا) سراغ مت لگایا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کرے۔ (سورۃ الحجرات آیت: ۱۲)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: گمان بازیوں سے بچو کیوں کہ (بے دلیل) گمان بازی کرنا بدترین جھوٹ ہے' شراحِ حدیث کے مطابق: گمان سے مراد بے دلیل الزام تراشی ہے جو جھوٹ کی بدترین قسم ہے، اس لئے کہ نرا جھوٹ جس میں کسی پر تہمت نہ ہو، اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا کہ بلا تحقیق کسی مسلمان پر تہمت لگانا برا ہوتا ہے کہ اول میں محض جھوٹ کا ارتکاب ہے، ایذائے مسلم کا پہلو نہیں جب کہ ثانی ان دونوں کبیرہ گناہوں کا مجموعہ ہے (مسلم مع تکملۃ فتح الملہم ۳۵۹/۵)

شریعت میں کسی مسلمان کے عیوب کی پردہ داری کا عالم یہ ہے کہ وہ کمزوریاں جو واقعۃً کسی انسان کے اندر پائی جاتی ہوں تاہم ان کی نوعیت شخصی اور ان کا نقصان غیر متعدی ہو تو ایسی خامیوں کی بھی پردہ پوشی، شریعت میں مطلوب ہے، ان کو بے حجاب کرنا اچھا نہیں، حد یہ ہے کہ وہ فاسق جو علی الاعلان فسق کا ارتکاب کرتا ہے، مگر اس کا کوئی عیب یا گناہ ایسا ہے جسے وہ در پردہ کرتا ہے تو اسکو بھی چھپانے کا حکم ہے (ریاض الصالحین: ۱۵۱/۴) اس بارے میں چند فرامین رسول ﷺ ملاحظہ ہوں: ارشاد ہے جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے' قیامت کے دن اللہ اسکے ساتھ ستاری کا معاملہ فرمائیں گے؛ محدث العصر شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی فرماتے ہیں: میرے خیال میں گناہ کی پردہ پوشی کا محل وہ گناہ ہیں، جو علی

الاعلان نہ کئے جاتے ہوں، جن کے مضر اثرات متعدی نہ ہوں، جن کا مرتکب عادی گناہ گار نہ ہو، ورنہ ان کی تشہیر جائز ہے (تکملة فتح الملہم ۳۸۶/۵)

یہی ہدایت محکمۂ احتساب کے اہلکاروں کے لئے بھی ہے کہ اگر کوئی شخص خفیہ طور پر حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے، جس کا نقصان متعدی بھی نہیں تو خواہ مخواہ محتسب کو اس کی تفتیش وٹوہ میں رہنے کی حاجت نہیں۔ (تکملة فتح الملہم ۳٦٠/۵)

معراج کی رات، دورانِ سیر آپ ﷺ کا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا، جو انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں تھی، اپنے جسم وجان کی دشمن بنی ہوئی تھی، تانبے کے لمبے لمبے ناخنوں کے ذریعہ نادان اپنے ہی چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، اسطرح خود سزائی کے عجیب عذاب میں مبتلاء تھے، ان کے بارے میں دریافت کرنے پر آپ ﷺ کو بتلایا گیا کہ یہ وہ بدکردار لوگ ہیں، جو اپنے بھائی بندوں کی غیبت کیا کرتے تھے اور بے وجہ ان کی آبروؤں سے کھیلا کرتے تھے (ابوداؤد: باب فی الغیبة: ۴۸۷۸)

صحافت کی راہ سے کسی کی ذاتیات میں دخل دینے سے قبل، ہر صحافی کو سو بار اپنے دل سے فتوی لینا چاہیے کہ آیا ان کو منظر عام پر لانے میں وہ مخلص، حق بجانب، خیر خواہ اور قوم وملت کا بہی خواہ بھی ہے یا محض غبارِ دل کو ہلکا اور انتقام کی نفسیات سے مغلوب ہوا جارہا ہے، ایسے مواقع پر یہ ارشاد ربانی ملحوظ نظر رہنا چاہئے: ''اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم عدل نہ کرو'' (سورۃ المائدہ آیت: ۸) یعنی کسی سے ذاتی پرخاش، تم سے بے انصافی کے سرزد ہونے کا سبب نہ بننے پائے، کسی کی دشمنی میں آدمی ایسا اندھا نہ ہو جائے کہ اس کی کھلی کھلی خوبیاں بھی دکھائی نہ دینے لگے بلکہ وہ الٹا خامیاں نظر آئیں، کسی نے سچ کہا ہے: چاہت کی آنکھ ہر خامی وعیب دیکھنے سے اندھی کوری ہوتی ہے اور خشمگیں غضب آلود نگاہیں کرید کرید کر خامیوں کو اجاگر کرنے والی ہوتی ہیں (الکامل فی اللغة والادب ۱۷۲/۱)

فحش کی اشاعت کا آلۂ کار نہ ہو

موجودہ دور کی صحافت، انسانی معاشرہ میں بے حیائی وبدکاری کے فروغ کا منظّم کردار

ادا کررہی ہے،انگریزی پرنٹ میڈیا تو اس میدان میں گویا جامہ سے باہر ہو چکا ہے،عریاں ونیم عریاں تصاویر کو صفحۂ اول کی زینت بنانا پھر ہر صفحہ پر کچھ نہ کچھ نسوانی خدوخال کو جگہ دینا، ان کی صحافت کا ایک لازمی حصہ بن چکا ہے، بدذوقوں اور نامور بے حیاؤں کے افکار اور گندے خیالات کی بڑھ چڑھ اشاعت کرنا،ان کے نزدیک فخر کی چیز ہے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہذب انداز میں دنیا بھر کی غلاظت، قارئین کے سامنے پیش کرنا،ان کے لائق ایڈیٹران؛ شاید خدمتِ خلق ہی کا ایک ضروری حصہ خیال کرتے ہیں، اردو صحافت اگرچہ ابھی تک اس سوقیانہ پن سے بڑی حد تک محفوظ ہے تاہم اسے بھی ہفتہ میں کم ازکم ایک دن اپنے بعض بد مذاق قارئین کے ذوق کی رعایت ضرور کرنی پڑتی ہے، ویسے روزآنہ ایک آدھ قابلِ اعتراض حالت والی تصویر شائع کرنے میں ان کو بھی اب کوئی باک نہیں رہا ہے،قوم کے عمومی رجحان کی بنا پر سینما کے پردہ پر بے حیائی کا مظاہرہ کرنے والے انسان نما گروہ سے متعلق ہر چھوٹی بڑی خبر کو شائع کرنا،اخبار کے چلن کے لئے ضروری خیال کرلیا گیا ہے۔

اس خصوص میں اسلامی نقطۂ نظر بے نظیر واقع ہوا ہے،فحش کی اشاعت خواہ کسی ذریعہ سے ہو، اسلام کی نگاہ میں سخت جرم بلکہ دنیوی واخروی عذاب کا پیش خیمہ ہے، اسلامی تعلیمات کی رو سے فحش کی سرکوبی کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شریعت میں فحش کاری اور جرائم کی خبروں کی اشاعت کی تو حوصلہ شکنی کی گئی ہے لیکن ان جرائم کی سزا میں تشہیر اور سزاوں کے نفاذ میں شدت پسندی عین علامتِ ایمان قرار دی گئی ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے: جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی بات کا مسلمانوں میں چرچا ہو، ان کے لئے دنیا و آخرت میں سزائے دردناک ہے۔(سورۂ نور آیت:۱۹) اللہ تعالی بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتے (سورۃ النساء آیت:۱۴۸) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: بے باک لوگوں کے سوا میری امت کے تمام افراد کے لئے معافی ہے، بیباکی یہ ہے کہ آدمی رات کی تاریکی میں کوئی غلط کاری کرے پھر باوجود یہ کہ رات کو پروردگارِ عالم نے اس کی پردہ داری کی تھی، صبح ہوتے ہی اپنی رات کی غلط کاری کی لوگوں کو اطلاع کرتا پھرے۔(مسلم مع تکملۃ الفتح:۶؍۴۸۳) ارشاد باری تعالیٰ ہے: زنا کرنے والی

عورت اور زنا کرنے والا مرد تو ان میں سے ہر ایک کو سو درّے مارو اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ذرا رحم نہ آنا چاہئے، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے (تا کہ ان کے ذریعہ سے تشہیر ہو اور ناظرین کو عبرت ہو اور دوسرے لوگ اس سے رکیں) (سورۃ النور:۲)

اعتدال کے ساتھ رواداری کی روش پر قائم ہو

مذہب وعقیدہ سے ہر انسان کی جذباتی وابستگی رہتی ہے، کسی قیمت پر وہ اپنے مذہب کے تعلق سے نازیبا تبصرے سننے کی طاقت نہیں رکھتا، صحافت کی راہ سے اگر ایسے ناشائستہ بیانات سامنے آتے ہیں، جن سے کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو پَل بھر میں پورا ماحول آتش زار ہو سکتا ہے، بدقسمتی سے آج خاص طور پر انگریزی صحافت کے کرتا دھرتا اس شرارت میں پیش پیش نظر آتے ہیں، وقفہ وقفہ سے صحافتی سطح سے دانستہ زہر افشانیاں پھر بے معنی معذرت خواہیاں، ان کی ایک عادت سی بن چکی ہے، خبروں کی رپورٹنگ میں بھی ان کی اس شریر ذہنیت کے نمونے ان کے روزناموں کی سطر سطر سے عیاں ہوتے رہتے ہیں، مذہبی تعصب کے کھلے مظاہرے حرف حرف سے جھلکتے ہیں، غیر مسلم ممالک کے مسلمان باشندوں پر ہونے والے مظالم کی داستانوں اور مسلم ممالک میں بیرونی طاقتوں کی جانب سے ہونے والی خون ریزیوں کو عمداً نہ صرف نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ بدبختانہ طور پر ظالموں کے ظلم کا جواز بھی فراہم کیا جاتا ہے، کسی مسلم مملکت میں ہونے والی اصلاحات کی رپورٹنگ کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا دنیا بھر کے مظالم کے پہاڑ وہیں توڑے جا رہے ہیں، بڑی صفائی کے ساتھ ایک طبقہ کے بھلے کارناموں کو بھی برائی کے قالب میں پیش کیا جاتا ہے، دوسری طرف اپنے کسی ایک ہم مذہب پر بھی کوئی آفت پڑتی ہے تو ساری دنیا کو سَر پر اٹھا لیا جاتا ہے، پوری سخاوت کیساتھ صفحات کے صفحات اس کے تذکروں، تبصروں، تجزیوں کیلئے وقف کر دئے جاتے ہیں، جب تک کہ اس قضیہ پر خواطر خواہ نوٹس نہیں لیا جاتا یہ سلسلہ بند نہیں کیا جاتا۔

انگریزی پرنٹ میڈیا کا یہ طریقۂ کار علاوہ ازیں صحافتی بددیانتی کا شاہکار ہے، اسلامی

نقطۂ نظر سے بھی سخت غیر آئینی ہیں، اسلام نے ایسے خیالات کے اظہار کی ہرگز اجازت نہیں دی ہے، جس کا مقصد صِرف اور صِرف غیروں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا ہو۔

ارشادِ باری ہے: اور دشنام (گالیاں) مت دو، ان (معبودانِ باطلہ) کو جن کو یہ (مشرک) لوگ خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں کیوں کہ (تمہارے ایسا کرنے سے) پھر وہ براہِ جہل حد سے گذر کر (یعنی غصہ میں آ کر) اللہ کی شان میں گستاخی کرینگے۔سورۃ الانعام آیت: ۱۰۸) قرآنِ کریم میں ایک آیت، مشرکین اور ان کے من گھڑت معبودوں کے انجامِ بد سے متنبہ کرنے کے طور پر یہ بھی ہے کہ: تم اور جن معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں، اس بارے میں فقہاء رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص اس آیت کو بھی مشرکین کو چڑانے کے سبب سے پڑھے تو اس کیلئے اس وقت یہ تلاوت کرنا بھی سبِّ ممنوع (منع کردہ گالی گلوج) میں داخل اور ناجائز ہے (معارف القرآن ۴۲۰/۳)

مدینہ میں مسلمانوں کے علاوہ اہلِ کتاب بالخصوص یہود کی بھی ایک خاص تعداد رہتی تھی، آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ان کے مذہبی جذبات کے احترام کی بھی مثالیں ملتی ہیں: ایک دفعہ ایک مسلمان اور یہودی کے مابین کوئی نزاع پیدا ہوگیا، بحث ومباحثہ کے دوران مسلمان کی زبان سے یہ جملہ نکلا، قسم اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کو دونوں عالم پر منتخب کیا، یہودی نے بھی تُرکی بہ تُرکی قسم اٹھائی کہ اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو دونوں عالموں میں برگزیدہ کیا، یہ جملہ سننا تھا کہ مسلمان نے فوراً اپنا ہاتھ اٹھالیا اور یہودی کو طمانچہ رسید کردیا، یہودی فریاد لے کر بارگاہِ رسالت ﷺ پہنچا، آپ ﷺ غضبناک ہوئے اور پھر گویا ہوئے: تم لوگ مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر فوقیت مت دو، ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگ انبیاء کے مابین مجھ کو فضیلت مت دو۔ (مسلم مع تکملۃ الفتح ۲۶/۵)

یہاں یہ امر ملاحظہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یا بقیہ انبیاء علیہم السلام پر فضیلت کا رکھنا، ایک طئے شدہ اور بحث سے بالاتر حقیقت ہے تاہم اس خاص موقع

سے ،اس حقیقت کا اظہار دوسرے مذہب کے ماننے والے کے جذبات کوٹھیس پہنچا رہا تھا اور اس بیان سے ایک اولوالعزم نبی کی تنقیصِ شان کا شائبہ نکل سکتا تھا ،اس لئے آپ ﷺ نے ایسی فضا پر روک لگادی ، پس حساس قسم کے خیالات کے اظہار سے قبل ،مصالح ومفاسد کا موازنہ کرنا اور ضرورت وبلاضرورت کی درجہ بندی کر لینا ، آدمی کی حکمت اور دُوراندیشی کی دلیل ہے ، ورنہ بے موقع غیر ضروری خیالات وافکار کے اظہار سے تخریب کاری کا ماحول وجود میں آسکتا ہے ، جو ظاہر ہے انسانیت کے حق میں کسی طرح فالِ نیک نہیں ہے ۔

ناقص تلاش واستقراء سے اسلامی صحافت کے یہ چند اصول دریافت ہوئے ہیں ، جن کی معقولیت شبہ سے بالاتر اور جن کی افادیت ماورائے بحث ہے ، علمبردارانِ صحافت اگر صرف انہیں چند اصولوں کا لحاظ رکھ لیں تو صحافت کی سوئی قسمت جاگ سکتی ہے اور فی الحال صحافت جس مکروہ روش پر چل پڑی ہے اس کا مداوا ہوسکتا ہے !

کال سنٹر کی ملازمت... ایک قابلِ تشویش پہلو

جدید ذرائع ابلاغ کی وسعت اور سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں دنیا کی تیز رفتار ترقی نے جہاں زندگی کے مختلف شعبہ ہائے عمل پر اپنا اثر ڈالا ہے، وہیں معیشت کے میدان میں بھی اس نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، موجودہ دور کی معیشت کا تانا بانا اس قدر وسعت اختیار کرچکا ہے کہ انسان اپنے شہر اور ملک میں بیٹھے، سمندر پار ممالک سے بآسانی تجارت ومعاملت اور خرید وفروخت کے معاہدے کرسکتا ہے، معیشت کے پھیلاؤ کا ایک مثبت اثر یہ بھی سامنے آیا ہے کہ روزگار کے مواقع بڑھ چکے ہیں، مختلف پیشوں اور کمائی کے ذریعوں میں بے پناہ اضافہ ہوچکا ہے، تاہم اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ موجودہ دور کی معیشت مادیت پرستی کا دوسرا نام ہے، آج کے دور میں دنیا کی معیشت جن طاقتوں کی مٹھی میں ہے وہ طاقتیں گویا مادہ پرستی میں اپنے دور کے فراعنہ ہیں، یہ بات ظاہر ہے کہ آج کی معیشت کے رگ وپئے میں سرمایہ داریت کا خون دوڑ رہا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے حامی یا تو وہ قوتیں ہیں، جن کے یہاں مذہب اور خدا کا سرے سے تصور ہی نہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جن کی تاریخ بدترین اخلاقی جرائم اور مختلف گھناؤنے کرتوتوں سے سیاہ پڑی ہے۔

اس نامسعود سرپرستی کا جو اثر دنیا کی معیشت پر پڑنا تھا وہ اپنے پورے لوازمات کے ساتھ پڑا، معیشت کی راہ سے ایسے، ایسے اخلاقی وانسانی جرائم معاشرے میں نمو پذیر ہوئے کہ خدا کی پناہ! حرام خوری، ذخیرہ اندوزی، سودخوری، رشوت ستانی، جھوٹ ودھوکہ دہی، حرص ولالچ، قتل وڈاکہ زنی، خاندانی نظام کی بربادی، عفت وعصمتوں کی پامالی، وغیرہ یہ وہ عناوین ہیں جو آج کی معیشت کا لازمی حصہ بن چکے ہیں، ہمارے شہر میں اس وقت کال سنٹرس کے ناموں سے کئی ایک تجارتی مراکز قائم ہوچکے ہیں، جو واقف کاروں کے مطابق نری مادیت اور مغربیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، اس موقع سے یہاں اس کی قانونی وفقہی حیثیت اور اس کے طریقۂ کار پر بحث کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ بعض اخلاقی مفاسد کی طرف توجہ دلانا ہے، کال سنٹرس کا اس وقت جو سب سے زیادہ باعثِ تشویش پہلو ہے، وہ وہاں کی بے پردگی، مرد وزن کا آزادانہ اور بے تکلفانہ اختلاط، ستر ولباس کے حدود سے

دانستہ بے اعتنائی ہے یہ تینوں ہی باعث ایسے ہیں، جو جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں، شب کی ملازمت مزید خطرناک ہے، کال سنٹرس کی ملازمت کے عنوان سے وہاں جو بے حیائی اور بدتمیزی کا سیلاب اُمڈ پڑا اس کی وضاحت احاطۂ تحریر سے باہر ہے نہ صرف غیر مسلم بلکہ بہت سے مسلمان خاندانوں کی نوجوان دوشیزائیں بھی ملازمت کے عنوان سے اپنے زیورِ حیا کا سودا کر رہی ہیں، نام نہاد روشن خیالی کا بھوت ان کے سرپرستوں کے دل ودماغ پر ایسا سوار ہے کہ وہ اس سلسلہ کی کسی لب کشائی اور اظہارِ خیال کو بھی معیوب سمجھتے ہیں اور بلا توقف دقیانوسیت کا نام دیتے ہیں۔

ضرورت واحتیاج کی صورت میں اسلام نے عورت کو معاشی دوڑ دھوپ میں حصہ لینے سے کبھی نہیں روکا ہے، البتہ یہ شرط ضرور عائد کی ہے کہ عورت، عورت کے قالب میں رہے، نسوانیت کے لبادہ سے باہر آکر اپنے جوہر نہ دکھائے، امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ حجاب کی فرضیت کے بعد حضرت ام المؤمنین سودہؓ کسی ضرورت سے باہر نکلیں، چوں کہ وہ بڑی جسیم تھیں، اس بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باوجود ان کے حجاب کی حالت میں ہونے کے، اندازہ کرلیا کہ یہ حضرت سودہؓ ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر ازواجِ مطہرات کے پردہ کا بڑا لحاظ اور فکر تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ازواجِ مطہرات بھی عام عورتوں کی طرح گھر سے باہر نکلیں، انھوں نے حضرت سودہؓ کو دیکھتے ہی کہا، بخدا آپ ہم سے چھپی نہیں ہیں، حضرت سودہؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ بارگاہِ نبوی میں نقل کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سن کر وحی کے انتظار میں کچھ دیر خاموش رہے پھر گویا ہوئے: **انہ قد اذن لکن ان تخرجن لحاجتکن،** یعنی اپنی ضرورت کے لیے تمھیں باہر نکلنے کی اجازت دی گئی ہے، ترجمان القران حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سورۂ احزاب کی آیت ۵۹؍ کے ذیل میں فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت سے باہر نکلیں تو اپنے چہروں کو سر کے اوپر والی چادر کے ذریعہ ڈھانپ لیں اور (ایسی کوئی ضرورت نہ ہو تو) صرف ایک آنکھ کے بقدر حصہ کھلا رکھیں، (التفسیر المنیر :۳۱/۱۱)

زمانۂ رسالت میں بعض عورتوں کے بارے میں صراحت کے ساتھ ذکر ملتا ہے کہ وہ اپنی

معاشی ضروریات کے لیے کسب اور کمائی کیا کرتی تھیں مگر پورے پردے کے ساتھ اور اپنی حیاء وعفت کی مکمل حفاظت کے ساتھ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کا یہ مشہور عرض واستفسار کتبِ احادیث میں موجود ہے کہ وہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کہ عرض کیں ''میں ایک کاریگر عورت ہوں، چیزیں تیار کر کے فروخت کرتی ہوں (اس طرح میں تو کما سکتی ہوں لیکن) میرے شوہر اور بچوں (کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے اس لیے) ان کے پاس کچھ نہیں ہے اور دریافت کیا کہ کیا وہ ان پر خرچ کر سکتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا! ہاں تم کو اجر ملے گا'' (طبقاتِ ابن سعد: ۲۱۲/۸، بحوالۂ عورت اسلامی معاشرہ میں)

غرض، میدانِ معیشت میں، عورت کے کردار کے تعلق سے اسلام نے بڑا ہی معتدلانہ اور دوراندیشانہ موقف روا رکھا ہے، اصولی طور پر، اسلام نے عورت کو معاشی دوڑ دھوپ سے سبکدوش ہی رکھا ہے، مرد وعورت کے جسمانی وفطری قویٰ کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے، ہر ایک کا میدانِ کار الگ ہی رکھا ہے، پھر ہر دو کو اس کی پوری اجازت وآزادی دی ہے کہ اپنے دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے جتنا چاہے ترقی کرے، ذرا گہرائی سے غور کیا جائے تو عدل ومساوات کا صحیح مفہوم بھی یہی نکلتا ہے، مغرب نے غلط فہمی سے آج کل مساوات کا مفہوم یہ سمجھ لیا ہے کہ عورت کو عورت کے دائرۂ عمل سے نکال کر مرد کے میدان کار میں جھونک دیا جائے، ظاہر ہے یہ مساوات نہیں بلکہ ظلم ہے، کسی بھی شئ کو اپنے اصل مرکز سے ہٹا کر غیر فطری محل میں رکھ دینا صریح ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے! نظامِ فطرت سے مغربی اقوام کے اس انحراف کے جو سنگین نقصانات پوری انسانیت کو بھگتنے پڑ رہے ہیں اور مغرب نے مساوات کے اس خودساختہ مفہوم کے جو بھیانک نتائج دیکھے ہیں، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں لیکن اتنی بات بہرِحال واضح ہے کہ مغربی معاشرہ میں انسانیت کی ایک مکمل صنف، اپنے فطری وظائف سے دستبردار ہو چکی ہے، بقول ایک دانشور کے مغرب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے، عورت کی حیثیت سے نہیں دیا ہے بلکہ مرد بنا کر دیا ہے عورت درحقیقت اب بھی اس کی نگاہ میں ویسی ہی ذلیل ہے جیسی پرانے دورِ جاہلیت میں تھی، گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی بچوں کی ماں ایک اصلی اور حقیقی عورت کے لیے اب بھی کوئی عزت نہیں ہے، عزت اگر ہے تو اس مردِ

مؤنث یا زنِ مذکر کے لیے جو جسمانی حیثیت سے تو عورت ہو مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو اور تمدن و معاشرت میں مرد ہی کے سے کام کرے ظاہر ہے کہ یہ انوثت کی عزت نہیں، رجولیت کی عزت ہے"

اسلام نے عورت کو معاشی الجھنوں میں پڑنے کی تائید تب کی ہے جب کہ کسب و کمائی کرنا، اس کے حق میں کسب برائے زیست کی شکل اختیار کر چکا ہو، باپ، شوہر، اولاد اور دیگر قریبی رشتہ دار، اس کی کفالت سے معذور ہو چکے ہوں، مطلق شوقیہ ملازمت یا حدودِ شریعت کو پس پشت ڈال کر کی جانے والی ملازمت کو اسلام نے کسی صورت گوارا نہیں کیا ہے، کال سنٹرس کی مروجہ ملازمت کی مجبوری یہی ہے کہ وہاں بے پردگی اور اختلاطِ مرد و زن گویا ملازمت کے اجزائے لازمہ سے سمجھے جاتے ہیں اور شریعتِ اسلامیہ نے مرد و زن کے بیجا اختلاط کو ایمان و اخلاق کے لیے سمّ قاتل قرار دیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ مرد و عورت جب تنہا ہوتے ہیں تو ان کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے (جو انہیں برائی پر آمادہ کرتا ہے) (ترمذی شریف عن عمرؓ)، اسلام نے حتی کہ عبادات جیسے مقدس عمل میں بھی، اختلاط کو برداشت نہیں کیا ہے، زمانۂ رسالت میں زندگی کے ہر شعبۂ عمل میں مرد و زن کے درمیان، نمایاں اور امتیازی خطوط قائم تھے، عورتوں کی تعلیم کا دن جدا تھا، عورتوں کی گزرگاہ کے تعلق سے خاص ہدایات تھیں، مسجد میں داخلے کا دروازہ مختلف تھا، مردوں اور عورتوں کی صفیں الگ الگ تھیں، وغیرہ، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (حیاء پاکدامنی مؤلفہ حضرت پیر ذوالفقار نقشبندی مدظلہٗ: ۱۲۶/۱۳۰)

اس سے سوا، اسلام نے بہت سی ایسی عبادتیں، عورت سے محض اس بناء پر مستثنیٰ رکھیں ہیں کہ وہ ان کی شانِ ستر و حجاب کے مناسب نہیں، جہاد عورتوں پر نہیں، جنازوں کی مشایعت کی عورت مخاطب نہیں، نماز با جماعت کی عورت مکلّف نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ان تفصیلاتِ بالا کو سامنے رکھتے ہوئے، کال سنٹرس کی ملازمتوں کو کہ جہاں مرد و زن کا قابلِ اعتراض حالت میں اختلاط گھڑی دو گھڑی کے لیے نہیں بلکہ دن رات رہتا ہے، کسبِ معاش کے ترجیحی ذرائع کے طور پر اختیار کرنا ایک صاحبِ ایمان مرد و عورت کے لیے لمحۂ فکریہ سے کم نہیں!